نقش و نگار

"نقش و نگار و رنگ و بو تازہ بہ تازہ، نو بہ نو"

جوش (ملیح آبادی)

مکتبہ جامعہ دہلی

بار اول ایک ہزار — سنہ ۱۹۳۶ء — قیمت غیر مجلد عہ مجلد عا

میں اپنے اس مجموعے کی اشاعت کے باب میں
اپنے مخلص دوست سردار روپ سنگھ جاگیردار ریاست
دھول پور کا بیحد شکر گذار ہوں، جن کے بغیر اس کی طباعت
خدا جانے کب تک معرضِ تاخیر میں رہتی۔

جوش



عمل أوياما

فہرست

"سخنہائے گفتنی"

نہ صرف ہماری دنیائے شاعری میں بلکہ ہماری کتابِ معاشرت میں بھی "بابِ اعتذار" جلی حروف میں لکھا جاتا ہے، اور میں دیکھتا ہوں کہ بعض وقت اس پُرتصنّع ادائے سے واقعی خدمت بھی لیجا سکتی ہے۔ شعر و سخن کے باب میں مجھے اپنی قدر و قیمت کے متعلق کسی قسم کا مغالطہ نہیں ہے۔ لیکن جناب جوشؔ ملیح آبادی کے اس مجموعے (نقش و نگار) کی تقریب لکھنے پر مجھے جناب سردار روپ سنگھ صاحب رئیس و جاگیردار ریاست دھولپور کے اصرار کے سامنے سپر ڈالدینا پڑی، کیونکہ وہ میرا کوئی عذر سُننے کے لئے طیار نہ تھے۔

سردار صاحب حضرت جوشؔ کے نہایت مخلص دوستوں اور سچے قدر دانوں میں سے ہیں، اور اس مجموعے کی تدوین و اشاعت اُنھیں کی قدر دانیِ سخن اور محبت کی مرہونِ توجہ ہے۔ اسی رشتے سے سردار صاحب مجھے بھی نظرِ لطف و کرم سے دیکھتے ہیں۔ سردار صاحب کے خلق و مروت نے مجھے سو سال پیشتر کا ہندوستان یاد دلا دیا جس کے قصے اب تاریخ کی کتابوں ہی میں نظر آتے ہیں کہ فلاں سید صاحب فلاں رائے صاحب کے بغیر رہ نہ سکتے تھے، فلاں خاں صاحب سے فلاں پنڈت جی کی دانت کاٹی روٹی تھی اور فلاں بادشاہ نے اس دھوان کو نوازا، فلاں راجہ نے اُس شاعر کو سرفراز کیا۔ تاریخ کا اپنے آپ کو دُھرانا ایک عام مقولہ ہے مگر مجھ پر اس کی صداقت سردار صاحب سے متعارف ہونے کے بعد ثابت ہوئی۔

جوشؔ کی شاعری پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے خاندانی حالات اور خود اُن

کے مزاج طبیعت کا مختصر ساخاکہ پیش کر دیا جائے، کیونکہ کسی شاعر کے کلام پر نظر ڈالنے میں ان حالات کا علم معاونت کرتا ہے اور اس کے عادات و اطوار کا علم ہونا از بس ضروری ہوتا ہے۔

شبیر حسن خاں جوش، ملیح آباد ضلع لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے جدِّ امجد محمد بلند خاں ہندوستان آئے اور دربار اودھ میں اتنا رسوخ بڑھا کہ ان کے صاحبزادے فقیر محمد خاں گویا افواج اودھ کے رسالدار ہوئے اور حسام الدولہ تہور جنگ کے خطابات پائے۔ فقیر محمد خاں گویا تخلص، ناسخ کے شاگرد اور صاحبِ دیوان تھے۔ ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے، مؤلف آبحیات نے ان کا ذکر کیا ہے۔ گویا کے تذکرے میں یہ بات اہم اور قابلِ لحاظ ہے کہ ایک پشت میں ایک تازہ ولایت افغان اس پائے کا شاعر نبجا تا ہے! ظاہر ہے کہ کسی زبان کی شاعری میں استادی کا مرتبہ حاصل کر لینا اسی صورت میں ممکن ہے کہ زبان پر کامل دسترس ہو جانے کے ساتھ اس شخص کی ذہنیت و مزاج بھی بالکل ویسا ہی نبجائے۔ رسالدار فقیر محمد خاں کے سوانح حیات مرتب کئے جانے کے لئے یہ تنہا خصوصیت سب سے بڑی سفارش ہے کہ نہایت قلیل مدت میں ان کو زبان پر ایسا عبور حاصل ہو گیا۔ ماحول میں گھل مل جانے کی صلاحیت و قابلیت کی یہ ایک نادر و فقید مثال ہے اور جوش صاحب جناب گویا کا تذکرہ مرتب کر کے نہ صرف اپنے خاندان کی خدمت کریں گے بلکہ طبع و مزاجِ انسانی پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے بھی ایک نادر شے مہیا کر دیں گے۔

نواب فقیر محمد خاں کے بیٹے نواب محمد احمد خاں احمد تعلقہ دار کمنڈی اور نواب بشیر احمد خاں بشیر یعنی جوش کے دادا اور والد بھی صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جوش نے شعر کی فضا میں آنکھ کھولی اور شاعری کی گود میں پلے بڑھے! اور ایسی صورت میں ان کا نو سال کی عمر سے شعر گوئی اختیار کر لینا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ فارسی اردو شاعری میں ایسی مثالیں نایاب بھی نہیں ہیں۔ غرض جوش کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب لکھنؤ کی فضا و ماحول شعر سے بسا ہوا تھا۔

صحیح استعداد شعری اور شاعری سے فطری لگاؤ ہونے کے باعث جوش کو چار سال کی شاگردی

میں محسوس ہوگیا کہ جناب عزیز لکھنوی (مرحوم) کی استادی کا میدان ان کی جولانی طبع کے لئے تنگ ہے۔ اس لئے بارہ تیرہ سال کی عمر تک تو اصلاح لی لیکن پھر سروشِ غیبی اور ذوقِ وجدان کی رہبری کو کافی سمجھا۔

تعلیمی اعتبار سے جوش نے گھر پر اُردو فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں اور پھر انگریزی کے لئے سیتاپور اسکول، جوبلی اسکول لکھنؤ کے علاوہ سینٹ پیٹر کالج آگرہ اور علیگڑھ کالج میں داخل ہوئے اور پڑھتے رہے لیکن تکمیل کہیں کسی بات کی نہ کر سکے۔ یہ شاید ممکن بھی نہ تھا۔ جوش کے مزاج میں ہمیشہ سے ایک والہیت سی ہے اور طبیعت کا انداز سخت لاأبالیانہ ہے۔

۱۹۲۴ء میں جوش سرکار نظام میں دار الترجمہ سے متعلق ہوگئے اور ۱۹۳۴ء میں ناظر ادب (لٹریری سینسر) کے عہدے سے الگ ہوئے۔ زمانۂ قیام حیدرآباد میں مدراس یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں کے ممتحن بھی مقرر ہوا کئے۔ خود بقول جوش یہ حیرت ہے کہ دس سال تک انھوں نے حیدرآباد کو کس طرح برداشت کیا اور اس سے بڑی حیرت یہ ہے کہ حیدرآباد نے ان کو کیونکر گوارا کیا۔ لیکن جہاں تک جوش کی شاعری کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ حیدرآباد کی علمی صحبتیں جوش کے جوہرِ قابل کو ابھارنے اور ان میں بالغ نظری پیدا کرنے کا سبب بن گئیں۔

جوش کی شاعری کی ابتدا تقلید سے ہوئی جب ان کے اشعار میں تصوف کی جھلک زیادہ ہوتی تھی ان کے اس عہد کے کلام کا ایک مجموعہ "روحِ ادب" کے نام سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ جوش اس وقت بھی اس قدر مقبول شاعر تھے کہ بہت قلیل مدت میں اس مجموعے کی تمام جلدیں ختم ہوگئیں اور اسی وقت سے نایاب ہے۔ اس مجموعے میں ایسا کلام بھی بہت ہے جو جوش کی آئندہ شاعری کی عظمت و بلندی کا نشاندہ ہے۔ جوش کی شاعری کا اصل آغاز اس وقت سے سمجھنا چاہئے جب سے انھوں نے روایات و مفروضات کی قید و بند سے اپنی گلوخلاصی کی اور مصنوعی کیفیات کے بیان کو ترک کرکے محض وارداتِ قلب اور مشاہدہ و تفکر کے تاثرات کو موضوعِ نظم قرار دیا۔ جوش کے مجموعۂ کلام میں یوں تو آپ

دیکھیں گے کہ انھوں نے محبت کے بیان میں نفسیات کو سمویا ہے عشق کے ذکر کو فلسفے سے سنوارا ہے لیکن اس نوع کی چیزیں تو کم وبیش دیگر شعرا کے یہاں بھی حسن وخوبی کے ساتھ نظم ہوئی ہیں۔ جوش کی شاعرانہ انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے انسانی ابتلا، و مصائب کو اس دل سے دیکھا ہے جو مخلصانہ ہمدردی سے لبریز تھا ... کہ ایک صادق القلب شاعر کی تعریف یہی ہے: حیات انسانی کا پُرالم نغمہ جوش نے ایسی دلدوز آواز میں سنایا اور قلب کی ان گہرائیوں سے نکالا ہے جس کی مثال ان سے پہلے صرف نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں ملتی ہے راقم الحروف کے عقیدے میں صداقت احساس و بیان میں نظیر جوش کا پیشرو ہے۔

جوش حلیم الطبع اور غیر منظّم مزاج کے انسان ہیں، اور مذاق شعری نے ان کے دل سے تحقیر و تنفّر کے جذبے کو اس حد تک نکال پھینکا ہے کہ ان کو دشمن کے بدی کرنے پر شرم آجاتی ہے!" لیکن جب اُن کے جذبۂ خودداری کو صدمہ پہنچتا ہے تو وہ دل آزاری کی بھی پروا نہیں کرتے۔ اقبال کا ایک مصرعہ ہے:-

"ہم نفس فرزند آدم را کجاست؟"

اس میں بالکل مبالغہ نہیں کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو کامل طور پر سمجھ لینا ناممکن ہے، لیکن جو لوگ جوش کو قریب سے جانتے ہیں ان کو علم واحساس ہے کہ رندانہ مسلک ہونے کے باوجود جوش کی روح کس قدر معصوم ہے! معصیت دراصل نفس کے داغدار ہو جانے کا نام ہے۔ جوش اصطلاحِ صوفیا میں سچے رند ہیں جوش کی بے نفسی اس سے ظاہر ہے کہ اس عالمگیر شہرت وعزت کے باوجود دوسرے شعراء کی طرح کلام سنانے میں تکلف و تصنّع روا نہیں رکھتے، اور آگے پیچھے پڑھنے کا رکیک جذبہ ان میں کبھی پیدا نہیں ہوتا، مزاج میں فیاضی اس قدر اور دل آنا غنی رکھتے ہیں کہ آبائی ورثے اور جائداد کا بہت بڑا حصہ عزیزوں کو دے بیٹھے سیر چشمی ترکے میں ملی ہے اور شرافت و مروت کا احساس ان کی نظم "اُترے ہوئے چہرے" سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے۔

جوش سخت زُود آشنا ہیں اور آزادہ روی کا یہ عالم ہے کہ نئے پُرانے احباب میں فرق مراتب کم رکھتے

ہیں یا کہئے کہ رکھ نہیں سکتے۔ لااُبالی پن کا یہ حال ہے کہ ان کے دوستوں کو ان کے متعلق بعض وقت ”آنکھ سے دُور دل سے دُور“ کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ میرے خیال میں یہ تمام باتیں ان کی فطنت GENIUS پر دلالت کرتی ہیں۔

اعتقاداً جوشؔ نے اوائل عمر میں شیعہ مسلک اختیار کر لیا تھا، اور مردم شماری کے دفتر میں اب بھی شیعہ ہی لکھے جاتے ہوں گے، لیکن اب ان کا مذہب وہی سمجھنا چاہیے جو تمام اہل نظر و حکمت کا ہوتا ہے۔ یعنی انسانی ہمدردی! جوشؔ نے اپنے متعلق اپنی نظم ”پروگرام“ میں سب کچھ کہہ دیا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر دیوان حافظ سے ایک انسانی پیکر طیار کیا جائے تو وہ بالکل جوشؔ ہوں گے بشرطیکہ اس میں ”چون پیر شدی“ والا شعر نکال دیا جائے: جوشؔ کے عقیدے میں یہ شعر حافظ کی تعلیم سے متناقض ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کسی روز زمانہ خود جوشؔ سے ایسا ہی شعر نہ لکھوا دے گا!

شعر کے باب میں جوشؔ کا نظریہ ان کے اُس مقالے سے ثابت ہے جو ان کے ماہنامے ”کلیم“ کے پہلے تمبر میں ”غزل گوئی“ کے عنوان پر نکلا ہے۔ غزل پر جوشؔ کو جو اعتراض ہے، ایک بڑی حد تک میں بھی ان کا ہم خیال ہوں لیکن یہاں مجھے ان سے اختلاف ہے کہ غزل کا کوئی شعر فطری نہیں ہوتا۔ مگر اس بحث کو چھیڑنے کا یہ محل نہیں۔

اس خیال کی صداقت مسلمہ ہے کہ کسی قوم میں شعر و ادب کا عروج اس وقت ہوتا ہے جب وہ قوم تہذیب و تمدن کے منتہائے کمال پر ہوتی اور اس کے قوائے عمل روبہ اضمحلال ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ ترقی تمدن کا نتیجہ عیش و تموّل ہے اور عیش و تموّل وہ چیز ہے جو قوموں کے قوائے عملی کو مضمحل کر دیتا ہے!

اُردو شعر کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری شاعری پروان ہی اس وقت چڑھی جب ہندوستان میں مسلمانوں کا تمدن روبہ انحطاط تھا، اور یہی وجہ ہے کہ اس میں غیر معمولی ترقی بھی ہوئی اگر مستثنیات سے قطع نظر کر لی جائے اور کثرت پر رائے قائم کرنے کا اصول صحیح سمجھا جائے تو پھر ہمارا یہ توقع کرنا کہ ہماری شاعری

میں اخلاقی پستیوں کے سوا بھی کچھ مل سکتا ہے، محال عقلی کی آرزو کرنا ہے جس شاعری کے آغاز میں جعفر زٹلی کا نام ملے اور جس کے عہدِ عروج میں رنگین و جان صاحب جلوہ آرائے بزم ہوں، اس پر نقد و جرح کرنا بھی لاحاصل ہے۔ لیکن بہر صورت عمل و ردِ عمل کا قانون غالب، مومن کو پیدا کر کے رہا۔ ایک نے اردو شعر کو سنجیدہ و متین اور مشاہدۂ تفکر کے نتائج کا حامل بنایا اور دوسرے نے بتایا کہ فطری احساسات اور صحیح جذبات کی نقاشی ہو تو شعر کیا چیز بن جاتا ہے!

الحاصل، نوعِ انسان کا ارتقاء منشائے قدرت ہے اور تہذیب و تمدن ارتقاء کا ناگزیر نتیجہ: دنیا کی تمام قوموں کے عروج و زوال کا راز اُن کی تہذیب و اخلاق کی بلندی و پستی میں مرکوز ہے، اور تمدن و اخلاق کی بلندی و پستی ایک فطری "دور و تسلسل" ہے! اس لئے اگر ایک قوم کے ذہنی ارتقاء کا ثبوت اس کے ادب و شعر سے ملتا ہے تو ادب و شعر ہی اس قوم کی پستی و بلندی کا آئینہ دار ہوتا ہے!

جنگ عظیم کے زمانے میں کسی اخبار میں میری نظر سے ایک مضمون گزرا تھا، اس کی غایت تصنیف یہ تھی کہ موجودہ جرمنی اپنے شعراء کی ساختہ پرداختہ ہے۔ اس خیال میں اگر کچھ صداقت ہے تو اس سے انکار ممکن نہیں کہ ادبار زدہ قوم میں ایسے شعراء کا پیدا ہونا مستلزم ہے جو اسے ذلت و نکبت کے گڑھے سے نکال کر پھر بامِ ترقی پر پہنچا دیں۔

تاریخ ہند پر نظر رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں کہ اٹھارھویں صدی عیسوی اختلال قومی، بالخصوص مسلمانوں کے انتہائی تنزل کا عہد گزرا ہے۔ اس پستی و ادبار کی تصویر عہد ناسخ و امانت کی شاعری میں نظر آسکتی ہے لیکن انسان نواز فطرت کا جذبۂ غیرت و حمیت زیادہ مدت تک خوابیدہ نہ رہ سکتا تھا یا دوسرے لفظوں میں ردِ عمل کے قانون کو برسرِ عمل ہونا ہی تھا چنانچہ حالی کی ہستی رونما ہوئی۔ حالی نے ہمیں بتایا کہ ہمارے اسلاف کی شان کیا تھی، اور ہمارا "وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر" ہمارے روشن ماضی کو ایک ابرِ غلیظ کی طرح کیونکر گندہ و تاریک کئے ہوئے ہے!

"ہر کسے را بہرِ کارے ساختند" ایک سچّا مقولہ ہے، اور فطرتِ الٰہیہ تقسیمِ کار کے اصول پر شدت و سختی کے ساتھ عمل کرتی ہے: حالی کو قدرت نے صرف اسی خدمت کے لئے مامور کیا تھا۔ اُس کے بعد کا کام اکبر کے سپرد ہوا کہ اپنے شعر کا آئینہ دکھا کر ہمیں اپنے خط و خال سے شناسا کر دے۔ اکبر نے ہمیں دکھایا کہ ہم اپنی صورت کو جس قدر حسین سمجھ رہے ہیں وہ اُتنی ہی مکروہ ہے۔

ماضی و حال کے یہ مرقعے پیش ہو چکنے کے بعد اقبال کا فرض یہ ٹھہرا کہ خودی کی مشعل جلا کر مستقبل کا راستہ روشن کر دے۔

اب ارتقاء کی رُوح کو اس کا بھی متقاضی ہونا چاہیے کہ حالی کی نوحہ خوانی، اکبر کی آئینہ برداری، اور اقبال کی مشعل نمائی کے بعد کوئی اور ہستی منظرِ عام پر رونما ہو جو نژادِ نو کو اسلاف کی شرافتِ نفس و خودداری بھی یاد دلائے، اخلاف کی ناتراشیدگی و بد قوارگی کا بھی احساس کرائے، اور اعتمادِ نفس و حرکت و عمل کی حرص بھی دلائے۔ یعنی حیات کی بشارت دے!

مسئلہ ارتقاء جس طرح حیات کے ہر پہلو اور ہر اسلوب میں جاری و ساری ہے، اس کے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس کا سختی کے ساتھ معتقد ہوں کہ افضل سے افضل تر پیدا ہوتا رہے گا، اسی لئے میں ارتقاء کی ہر کڑی کو اپنی جگہ اہم ترین باور کرتا ہوں: اس لئے میرا یہ خیال کہ حالی، اکبر اور اقبال کی شاعری کا ارتقاء جوش کے شعر میں نظر آتا ہے، میرے اسی عقیدے کا نتیجہ ہے! کیونکہ جوش کی شاعری میں مجھے زندگی نظر آتی ہے جو ان کے پیشروؤں کے یہاں نہ تھی — اور نہ ہو سکتی تھی! جوش کا کلام غزلیہ و نشاطیہ ہو یا طنزیہ و المیہ، رندانہ و شاعرانہ ہو یا مصلحانہ و حکیمانہ، شروع سے آخر تک حرکت و حیات سے مملو دکھائی دیتا ہے!

یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ ماضیِ قریب کے ادبیات سے ذاتی تاثرات الگ نہیں کئے جا سکتے، اور عصری ادبیات سے نہ صرف ذاتی تاثرات وابستہ ہوتے ہیں بلکہ اس میں جذبات بھی شامل ہوتے ہیں، اس لئے حالی و اکبر کی شاعری سے جو ہمارا قریب ترین ماضی ہے اور اقبال کے شعر کی متعلق جو قاطبتاً عصری ہے اس

نوع کی گفتگو کرنا ایک نازک مسئلے سے بحث کرنا اور بڑی جسارت ہے! چنانچہ میں خالی الذہن نہیں کہ میرے اس اظہارِ خیال پر بعض پیشانیوں پر شکنیں آجائیں گی، بعض بدنوں میں جھرجھری پیدا ہوگی، اور بعض مبارک زبانوں سے کچھ کلمے بھی ادا ہوجائیں گے! لیکن میں بصد معذرت عرض کروں گا کہ اس وقت میرا روئے سخن شخصیت پرستوں سے نہیں ہے۔ میرے مخاطب صحیح صرف وہ لوگ ہیں جن کی نظر بالغ ہے، اور جو ارتقائے شعر و ادب کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر کے کلام کے عام اثرات بھی دیکھ سکتے ہیں

پچھلے سال لاہور کے ایک عظیم الشان ادبی اجتماع میں جس کو شاعرِ مشرق ڈاکٹر ٹیگور اور بلبل ہند مسز سروجنی نائڈو کی شرکت کا فخر حاصل تھا، مجھے معلوم ہوا تھا کہ صدرِ بزم محترمی پنڈت برج موہن دتاتریہ صاحب کیفی نے جوش کے تعارف میں یہ بھی فرمایا تھا کہ جوش کی شاعری نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ آنکھیں نیچی کئے بغیر اپنی شاعری کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔

جوش کی اس خوش بختی سے مجھے خوشی ہے کہ ان کو اپنی زندگی میں ایسی داد و تحسین نصیب ہوئی لیکن بہرحال داد و تحسین اور خاص کر عصری داد و تحسین ناقابل اعتبار شے ہے: ذوق اور داغ کا قبول عام ہمارے سامنے کی بات ہے۔ اسی طرح غالب کا مردود ہونا بھی۔ میرے خیال میں شعر کی سچی قدر داد و تحسین سے نہیں بلکہ اس استفادے سے ثابت و قائم ہوتی ہے۔ اور استفادے سے میرا مفہوم وہ انقلاب و اثر ہے جو کسی شاعر کا کلام لوگوں کے خیالات و احساسات میں پیدا کر دیتا ہے۔

میں نے کسی دوسرے مضمون میں اپنے عقیدۂ شعری کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "جس طرح اصل مذہب ایک ہے اسی طرح اصلِ شاعری بھی ایک ہے، اور جس طرح تہذیب اخلاق کے لئے مذہب کی ضرورت ہے اسی طرح تہذیب نفس کے لئے شعر کی حاجت ہے!" اور اسی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کا رونما ہونا اور شعر کا صورت پذیر ہونا انسانی فطرت کی ایک ضرورت ہے! یہ بالکل ممکن ہے کہ مہابھارت، ایلیڈ، اور شاہنامے کی سی کتابیں ایک مدت

مدیدتک یا کبھی بھی وجود میں نہ آئے، لیکن جذباتی شاعری اس وقت تک لزوماً وضروری ہوتی رہے گی جب تک انسانی سینوں میں جذبات ابھرتے رہیں گے، اور جس وقت تک ہم میں احساس باقی ہے ہم شعر سننے اور سر دھننے پر مجبور ہیں! اناٹول فرانس کے بقول ہماری مسرتیں غیر منظم اور ہمارے الم مبہم ہوتے ہیں وہ چیز شعر ہے جو ہماری مسرت والم کو مرتب اور منوّر کر دیتی اور ان کو زبان عطا کرتی ہو! شعر درحقیقت روح انسان کی آواز ہے، شعر کے ذریعے ہمیں اپنی خوشی وغم کا شعور ہوجاتا ہو!

شعر وشاعری کے بیان میں میں نے کہیں پڑھا ہو کہ لباسِ خیال کو زندگی کے قامت پر موزوں کر دینا شاعری ہو۔ کوئی شک نہیں کہ شاعری کی یہ ایک جامع تعریف ہو، لیکن شعر کی ایک حیثیت تو صوری ہو دوسری معنوی اور یہ تعریف روح شعر پر منطبق نہیں ہوتی۔ شعر اسی صورت میں علوئے مقصود کو پہنچتا اور کامیابِ مدّعا ہوتا ہو جب اس میں شعری صداقت (POETIC TRUTH) اور شعری حسن (POETIC BEAUTY) بھی ہوتا ہو۔ اور یہ باتیں لباسِ خیال کو زندگی کے قامت پر موزوں کردینے کے علاوہ ہیں۔ صداقت اور حسن شعری کے لئے اعلیٰ درجے کی سنجیدگی لازمی ہو، اور یہ متانت کامل خلوص بیان (SINCERETY) سے پیدا ہوتی ہو جو ایک وہبی جوہر ہے! شعر میں خلوص بیان اور تاثیر کلام لازم وملزوم ہیں!

جوش کے کلام پر فنی اعتبار سے نظر ڈالنا تو کسی واقفِ فن کا کام ہے، میں صرف ان کے شاعرانہ احساسات اور ان کے شعر کی کیفیات و اثرات کے متعلق کچھ اشارے کروں گا۔ شعر کے باب میں اوپر کی سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس نقطۂ نظر سے میرے خیال میں جوش ایک کامیاب شاعر ہیں۔ وہ صحیح معنی میں شاعرانہ دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے ہیں اور قدرت نے نہ صرف ان کو ملکۂ شاعری سے بہرہ ور کیا ہے بلکہ ان کے یہاں وہ خلوص بیان جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے۔ بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ شعر میں جس جوش وخروش کو ضروری عنصر قرار دیا گیا ہے، جوش کے کلام میں وہ بھی بغایت موجود ہے۔ ان کے شعر میں وہ سچائی ہے جو ان کے فلسفے کو ابھار دیتی ہے وہ ترنم ہے جس میں ضعف نہیں ہوتا۔ جوش کی رندی کفر والحاد کی حد تک

ہے، لیکن اس کفر والحاد میں نیکی و پاک نفسی شامل ہے کیونکہ مذہب کی روح محبت و احترامِ انسانیت ہے اور اس کی جوشؔ کے یہاں کمی نہیں! "رجائیت" جوشؔ کے مذہب سے خارج ہے، ان کو "قنوطی" کہا جا سکتا ہے لیکن دراصل وہ امید کرنا بھی پسند نہیں کرتے: وہ زندگی میں "ہم آہنگی" (HARMONY) دیکھتے ہیں اس لئے زندگی کے ساتھ نغمہ سرا ہو جاتے ہیں یعنی "زندگی" ہی کا سُر الاپتے ہیں۔ وہ اگر غمِ روزگار سے متاثر ہوتے ہیں تو شکایتاً نہیں بلکہ اس کو بھی حیات کی ہم آہنگیوں ہی میں سے باور کر کے متاثر ہوتے اور بیان کر دیتے ہیں۔ "مطالعہ و نظر" کے عنوان سے جو مختلف اشعار اس مجموعے میں شامل ہیں، اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:-

کڑی دھوپ آگ برساتی ہے جب گلزارِ عالم پر — تخیُّل ابر کا ہوتا ہے سبزے کے تغیُّر میں

یونہیں خونریز و خوں آشام تلواروں کو ہستی کی — مرا دل تولتا ہے تیری رحمت کے تصوُّر میں

صناعت کے باب میں یہ نکتہ اہم ترین و نادر ترین خصوصیت ہے کہ صنّاع کو فطری رہنا چاہیئے: جوشؔ ایک سچے اور فطری شاعر ہیں اس لئے کہ وہ ایک سچے اور فطری انسان ہیں۔ ان کی شاعری کا مرتبہ اس وجہ سے بہت بلند ہو جاتا ہے کہ ان کے کلام اور ان کی زندگی میں مطابقت ہے، اور سادگی اور سچائی ہر جگہ اور ہر وقت نظر آتی ہے: یہی چیز شعر کی صورت میں ڈھل کر تاثیر بن جاتی ہے جس کے سبب سے شعر دل میں اتر جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جوشؔ کے شعر کے اس درجہ دلنشیں و دلاویز ہونے کا راز یہی ہے۔

جوشؔ معمولی باتوں اور دقیق مسائل، سادہ حسّیات اور پیچیدہ جذبات کی نقاشی جس طرح کر جاتے ہیں اس سے اس بات کا اندازہ بآسانی ہو جاتا ہے کہ ان کو زبان پر کتنی قدرت حاصل ہے، نظم کا کیسا ملکہ ہے اور ان کا ادراک و احساس کتنا صحیح و نازک ہے!

شعر سے متعلق ایک نازک حقیقت یہ بھی ہے کہ ایک شاعر جس درجہ ثقیف (CULTURED) ہوگا اتنا ہی بلند و نازک شعر کہہ سکے گا، ورنہ دیگر تمام اوصاف سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اگر اس میں ثقافت (CULTURED) کی کمی ہے تو اس کا شعر اُس علو کو حاصل نہ کر سکے گا جو ایک عمدہ شعر کے لئے ضروری ہے

جوشؔ کے کلام سے ان کی ثقافت کا بھی بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے اور جہاں تک شعر و ثقافت کا تعلق ہے شعر فہمی کے لئے بھی ثقافت اتنی ہی ضروری ہے جتنی شعر گوئی کے لئے۔

غزل کے مقبولِ عام ہونے اور دیوانوں کی ردیف وار ترتیب نے ہمیں دو باتوں سے محروم کردیا: ایک تو یہ کہ ہم اپنے شعراء کے کلام سے ان کے کردار و سیرت کا اندازہ نہیں کرسکتے، اور دوسرے یہ کہ ان کی شاعری اور اس طرح ان کے ذہنی ارتقاء کے مدارج مرتب نہیں کئے جاسکتے۔ جوشؔ کی شاعری ان کے کردار و سیرت کا آئینہ ہے اور اگر کسی سبب سے ان کے حالاتِ زندگی ناپید ہوجائیں اور کلام محفوظ رہے تو آئندہ کسی کے لئے بھی ان کے کلام سے ان کا تذکرہ مرتب کرلینا دشوار نہ ہوگا۔ ان کے مجموعۂ کلام سے ان کے ارتقائے ذہنی کو بھی بہ سہولت پڑھا جاسکتا ہے۔ شکر ہے اب ہمارے شعراء اگر ردیف وار دیوان مرتب کرتے ہیں تو تاریخ کا التزام بھی کرنے لگے ہیں۔ کاش ان کے کلام و زندگی میں مطابقت بھی رونما ہونے لگے!

المختصر، ایک حقیقی شاعر کے لئے جس چشمِ بینا اور جس دلِ آگاہ کی ضرورت ہے۔ قدرت نے جوشؔ کو وہ آنکھ اور وہ دل عطا فرمادیا ہے۔ اس مجموعے میں جو دراصل ان کے کلیات کا ایک باب ہے جوشؔ کے ہمہ گیر مشاہدے اور نزاکتِ حسیات کا وافر ثبوت ملتا ہے۔

شعر و شاعری کے باب میں مختلف و متنوع نظریے جاری و ساری ہیں: ایک خیال یہ بھی ہے کہ شعر میں، زبان و خیال، دونوں جہت سے، نُعومت (نرم و نازک ہونا) یا بالفاظِ دیگر اس میں روانی اور گھلاوٹ ہونا چاہئے۔ جوشؔ کے یہاں نعومتِ شعری کی کمی ہے۔ اس کا ایک بیّن سبب تو ان کا نسلی مزاج کہا جاسکتا ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جذبات میں یہ کیفیت محبت کی فنادگی اور خودی کی نفی سے پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ جذبات اپنے اظہار کے لئے ویسے ہی نرم نازک اسلوب و الفاظ انتخاب کرلیتے ہیں، لیکن یہ خصوصیت "زندگی" کے منافی ہے، جوشؔ جس کے علمبردار ہیں! اس لئے اس قسم کی نعومت جوشؔ کے شعر میں ڈھونڈھنا غلطی ہے۔

یہاں تک جو اشارات کئے گئے ہیں، رواج عام کے مطابق، ان کو مثالوں سے ثابت کرنا دشوار ہے، کیونکہ ان کا تعلق بیشتر وجدان و سلامتی ذوق سے ہے: ان نتائج پر پہنچنے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ جوش کے کلام کا غائر مطالعہ کیا جائے اور اس سے جو اثرات مترتب ہوں ان کے ذریعے سے رائے قائم کی جائے۔

جوش کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے والا اس نتیجے پر ضرور پہنچے گا کہ انھوں نے حافظ شیراز کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان میں حافظ کا رنگ رچ گیا ہے۔ جوش نے روایتی غزل کہنا تو ایک مدت سے ترک کر دیا ہے لیکن وہ غزل مسلسل یا قطعہ کہئے کہ ایک ردیف قافئے میں نظم لکھتے ہیں۔ ہماری شاعری اگرچہ دو سو سال سے فارسی کی تقلید کر رہی ہے مگر کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایک حافظ یا سعدی پیدا نہ ہو سکا! لیکن آج جوش کی ان غزلوں یا نظموں کو سنکر محسوس ہونے لگتا ہے کہ بلبل شیراز اردو میں نغمہ سرا ہے: وہی جوش و خروش ہے اور وہی انداز بیان، وہی دلنشینی ہے اور وہی طرز کلام۔ اس ضمن میں میرے دوست حضرت جگر مرادآبادی میرے خیال سے بالکل متفق ہیں مگر ان کی رائے میں جوش کے یہاں حافظ کی روحانیت نظر نہیں آتی اور میں جگر صاحب کی رائے تسلیم کرنے کو آمادہ ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یہ شے فراوانی تفکر کے باعث خود جوش کے اندر موجود نہیں۔ غرض جوش کی اس قسم کی نظمیں کافی تعداد میں ہیں جو ایک مجلد میں "بادۂ سرجوش" کے نام سے شائع ہو رہی ہیں۔ لیکن اس مجموعے میں بھی "یہ نظر کس کے لئے ہے"، اور "یوم بہار" وغیرہ چند نظمیں اسی نوع کی شامل ہیں۔ "یوم بہار" کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

شکر خدا کہ طرۂ طرفِ کلاہ دوست — مشعل فروزِ مجلسِ روحانیاں ہے آج

پھر چہرۂ بشریہ ہے رنگِ الوہیت — پھر فرش خاک پر سرِ کروبیاں ہے آج

رندوں کے ساتھ روحِ دو عالم ہے رقص میں — یوم طوافِ کعبۂ رطلِ گراں ہے آج

ہر آرزو کے فرق پہ کج ہے کلاہِ ناز — "عین الیقیں" بہشت کا وہم و گماں ہے آج

ہر خشک تریں گونج رہی ہیں حکایتیں — ہر ذرہ حقیر کے منہ میں زباں ہے آج
رہ رہ کے اڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ — کیا جانے کس لباس میں عمر رواں ہے آج

میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جوشؔ کی شاعری خود ان پر گزری ہوئی کیفیتوں کا مرقع ہے۔ لیکن اس خصوصیت کے باعث ان کی نظموں کا آخری ایک دو شعر جو مادی بیان پر مشتمل یعنی خود شاعر کے کسی ذاتی واقعے سے متعلق ہوتا ہے، قاری یا سامع کے لئے ایک امتحان ثابت ہوتا ہے: نظم کی شاعرانہ کیفیات و تخیلات سننے یا پڑھنے والے کو عالم خیال میں جس بلندی پر پہنچا دیتے ہیں۔ یہ آخری شعر دفعتاً اسے پستی کی طرف لے آتا ہے۔ مثلاً اس مجموعے میں آپ ایک نظم "جامن والیاں" دیکھیں گے: برسات کا موسم عام طور پر وجد آفریں ہے، لیکن ایک پرستار فطرت کے لئے تو برسات کے مناظر خدا جانے کیا قیامت ہوتے ہیں! ہمارا شاعر فطرت پرست اپنے ساتھ ہمیں بھی محو منظر کر لیتا ہے۔ پہلے بند میں بھونرے کو "روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی" اور "رو بہ رہی ہیں ندیاں ساون کے نغموں کی طرح"، کی نادر اور حسین تشبیہوں سے قطع نظر، ہمارا تصور برسات کا ایک منظر دیکھتا ہے جس کے افق پر چند دہقانی عورتیں نظر آتی ہیں۔ دوسرے بند میں ایسے منظر کو جو اکثر ہماری نظروں سے گزرتا اور قابل التفات نہیں ہوتا، ہمارا شاعر ایک شہ پارۂ صناعت بنا کر پیش کرتا ہے، اور ہمارا خیال بھی "انگڑائی کی صورت" میں بلندی کی طرف چلا جاتا ہے۔ لیکن آخری بند کا آخری مصرعہ "جوش ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی" ہماری قوت متصورہ کو مادیت کی طرف لے آتا ہے اور ہم ایک صدمہ سا محسوس کرتے ہیں۔

جوشؔ کے محاکات

میرے خیال میں باعتبار محاکات جوشؔ اس وقت اس لئے فرد ہیں کہ وہ کسی تصویر کے پیش کرنے میں چند ایسے پہلو چن لیتے ہیں کہ پورا مرقع اپنے جزئیات و ماحول کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ اس مجموعے میں

ایسی نظمیں کم ہیں، لیکن دو ایک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں "جمنا کے کنارے" کا ایک مرقع ملاحظہ ہو:۔

افسوں بہ نگاہ و زلف بر دوش — غرفے میں کھڑی ہوئی ہے خاموش
فردوس کے در کئے ہوئے باز — ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز
رنگیں کلائیوں کو جوڑے — چہرے کو ہتھیلیوں پہ رکھے
گلدان میں پھول ہنس رہا ہے — قرآن ہے کہ رحل پہ دھرا ہے

"نظارۂ ماضی" ایک دوسری نظم ہے۔ اس کی ایک تصویر دیکھئے:۔

دیوی ہے سحر کی جلوہ گستر — جھونکے ہیں نسیم کے معطر
خاموش ندی پہ ہے دھواں سا — سبزے پہ ہے دھوپ کا گماں سا
کیا مست ہوائیں آرہی ہیں — کوکو کی صدائیں آرہی ہیں

"کوہستان دکن کی عورت" ایک اور نظم ہے، اس کو پڑھئے اور تصور قائم کیجئے: جو صورتیں سامنے آئیں گی وہ وہی ہوں گی جو دکن میں چلتی پھرتی دیکھی جاتی ہیں۔ اس نظم میں تناسب الفاظ اور ان کے برمحل استعمال کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

جوش کے خمریات

اردو ذخیرۂ اشعار میں اس موضوع پر بہت کافی انتخاب مل جائے گا، اور نہایت عمدہ شعر آپ کے سامنے آئیں گے جس میں ریاض خیر آبادی (مرحوم) کا نام سرفہرست ہوگا۔ لیکن جوش کے خمریات کے سامنے وہ سب ایسے معلوم ہوں گے جیسے شراب کے مقابلے میں پانی۔ اپنی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جوش کا اس قسم کا کلام مجھے حافظ و خیام سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس ذیل میں میں ان کی نظم "چند جرعے" کی طرف توجہ دلاؤں گا جو جوش کے خمریات میں بھی اپنی نوع کی ایک ہی نظم ہے: اس میں انھوں نے مے نوشی کی کیفیات کے درجے

نظم کئے ہیں جس کے باعث وہ خاص طور پر قابلِ لحاظ اور خصوصیت لئے ہوئے ہے :-

پہلے جرعے میں ہمارے شاعر کے دل میں کوئی کروٹ سی لیتا ہے اور پھر :-

یہ کس کی سن رہی ہے روح آہٹ — رگوں میں ہے مزے کی سنسناہٹ
زہے رفتارِ خونِ زندگانی — بغیر اسباب شادی شادمانی
سخن کی داد خود سے پا رہا ہوں — کلی کی طرح کھلتا جا رہا ہوں

اس کیفیت میں اسے ایک آواز آتی ہے کہ "بدمستی بہ از زہد ریائی"، تو وہ پھر ساغر اٹھا لیتا ہے اور دوسرے جرعے میں :-

رگ و پے میں ہے غلطاں نوجوانی — ہر ایک لمحہ ہے عمرِ جاودانی
گراں زنجیرِ دانش گل رہی ہے — متانت کی جوانی ڈھل رہی ہے
یہ کیسی طرفگی ہے آج ساقی — صراحی میں ہے وجہِ نورِ باقی

پھر وہی آواز آتی ہے اور وہ پھر تیسرا جرعہ لے کر "زہدِ ریائی" کو غرق کرنا چاہتا ہے :-

ندی ساون کی چڑھتی آ رہی ہے — سوئے میخانہ بڑھتی آ رہی ہے
سرِ میخانہ حوریں آ رہی ہیں ، — نگاہیں رام رس ٹپکا رہی ہیں
فنا کی بیڑیاں پھر گل رہی ہیں — بقا کی مشعلیں پھر جل رہی ہیں
بڑھا جاتا ہوں دریا ہو کہ وادی — مبارک دولتِ خود اعتمادی

دوسرے جرعے میں "گراں زنجیرِ دانش" گلی اور تیسرے میں فنا کی بیڑیاں گل گئیں ۔ شاعر کو پھر آواز آئی اور خود اعتمادی پیدا ہو جانے کے بعد اس نے تعمیل میں پھر ساغر بھر لیا تو :-

عجب شاہانہ کیفیت ہے طاری — ستاروں پر ہے میرا حکم جاری
مجازی صورتوں پر ہے بحالی — حقائق ہو چکے ہیں لاابالی

چمکتی ہیں بتوں کی بالیاں سی — فضا پر بج رہی ہیں تالیاں سی
جوانی روح میں اٹھلا رہی ہے — نظر پر کاکلیں بکھرا رہی ہے

جب ہستی کے امتیاز بھی مٹ چکتے ہیں تو پھر وہی آواز آتی ہے، اور پھر تعمیل کیجاتی ہے، اور یہ چرچے ہیں:-

تعالی اللہ شان خود نمائی — بھرا ہے خاک میں زور خدائی
ہتھیلی پر لئے ہوں گلستاں کو — کہاں کا گلستاں سارے جہاں کو
جبینِ "حال" پر ہے نقشِ "ماضی" — کوئی حد بھی ہے ان بدمستیوں کی
مجھے ارض و سما سے کد نہیں ہے — وگرنہ مستیوں کی حد نہیں ہے

یہاں تک کہ مستی کے اندر نہ صرف "زہد ریائی" بلکہ "خودی" بھی غرق کردی جاتی ہے!

جوش کی وطنیت

وطن پرستی کا جذبہ جوش کی برترین خصوصیات ہے اور ان کی وطن پرستی انسانیت پرستی کے ذیل میں ہے۔ حریت یا آزادی ایک ایسا لفظ ہے جس کی صحیح تعریف کرنے میں دنیا اس وقت تک ڈانواڈول ہے۔ اسلام کا درس حریت، حریت فکر میں مرکوز ہے، اور جوش اسی کے مبلغ ہیں۔ ان کا اس قسم کا کلام ایک مجموعے میں "آتشکدہ" کے نام سے شائع ہو رہا ہے، لیکن اس مجموعے میں جو چند نظمیں "غریب الوطن" اور "الوداع" وغیرہ شامل ہیں، ان کے دیکھنے سے بھی جوش کے جذبۂ وطنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جوش کی ریا دشمنی

مکر و ریا جو آج کل ہمارا اوڑھنا بچھونا، اور جس وجہ سے مذہبی تقدس ہمارا مال تجارت بن گیا ہے جوش

اُس کے سخت ترین دشمن ہیں۔ اس موضوع پر ان کی متعدد نظمیں ہیں اور اس مجموعے میں بھی "جواب اس شب کا دنیا میں نہیں ہے" اور "وقت مروت" وغیرہ کے پڑھنے سے ان کے احساسات کا پتا ملتا ہے

جوش کے شبابیات

شبابیات کو جوش کا مخصوص موضوع سخن سمجھنا چاہئے، کیونکہ اس مبحث پر وہ اپنے حقیقی رنگ و مذاق میں پوری طرح پر نمایاں ہو سکتے ہیں، اور "زندگی" کا تحرک بھی اسی عنوان کے تحت بہتر طریق پر ظاہر ہو سکتا ہے اس مجموعے میں ان کی متعدد نظمیں ہیں، مگر میں یہاں ان کی ایک نظم بعنوانِ "جوانی" کی طرف توجہ دلاؤں گا جو انھوں نے نظیر اکبرآبادی کے انداز پر نظیری کی بحر میں لکھی ہے: جوانی کی شرح اس سے بہتر و بلند تر شاعری میں تصور نہیں کیجا سکتی۔ ٹیپ کے مصرعے پڑھ کر وجد کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔

جوش کی زبان

جوش کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زبان سے گفتگو کرنا ناگزیر سا ہے۔ جوش کی شاعری دو جداگانہ قسم کی زبانوں میں منقسم ہے: ایک تو وہ جو فارسیت لئے ہوئے ہے اور "یوم بہار" وغیرہ قسم کی نظموں میں نظر آتی ہے، دوسری وہ جو "یہ کون اٹھا ہے شرماتا" کے ذیل کی نظموں میں ملتی ہے۔ بعض جگہ یہ دونوں انداز ملے جلے ہیں، لیکن ایک خصوصیت دونوں رنگوں میں مشترک ملے گی اور وہ توازن لفظی کی خصوصیت ہے کہ موسیقی و ترنم کہیں زائل نہیں ہو پاتا تناسب لفظی کے اعتبار سے ان نظموں میں جو فارسی آمیز زبان میں کہی گئی ہیں "دبیریت" کی جھلک آجاتی ہے اور بعض جگہ اغلاق پیدا ہو کر تناسب کو زائل کر دیتا ہے لیکن بالعموم جوش کے یہاں تناسب لفظی پایا جاتا ہے اور اس مجموعے میں ان کی نظم "کوہستان دکن کی عورت" مثالاً پیش کیجا سکتی ہے

مگر میری نظر میں جوش کی لسانی خصوصیت وہاں نمایاں ہوتی ہے جہاں وہ ٹھیٹ ہندی لفظ اور محاورے استعمال کرتے ہیں: ان کا یہ استعمال اس قدر حسین اور اس درجہ دلنشیں ہوتا ہے کہ انسان جھومنے لگتا ہے۔ جوش کا ایسا کلام پڑھ کر یقین ہونے لگتا ہے کہ زبان کی گھلاوٹ جس چیز کا نام ہے اردو میں عربی فارسی عنصر بڑھانے سے نہیں بلکہ ہندی شامل کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ جوش کی تقلید دوسری خصوصیات کے علاوہ اس ذیل میں بھی کیجا رہی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب عربی فارسی الفاظ کی "درآمد" بند ہو جائے۔ اس مجموعے کی پہلی نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:۔

رُخ پہ سُرخی آنکھ میں جادو — بھینی بھینی بر میں خوشبو
بانکی چتون سمٹے ابرو — نیچی نظریں بکھرے گیسو

یہ کون اٹھا تا ہے شرماتا

نیند کی لہریں گنگا جمنی — جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا مسکی ساری — ہلکی مہندی دھندلی بندی

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

ڈوبا ہوا رُخ تابانی میں — انوارِ سحر پیشانی میں
یا آبِ گہر طغیانی میں — یا چاند کا ٹکڑا پانی میں

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

رخسار پہ موج رنگینی — کچی چاندی سچی چینی
آنکھوں میں نقوشِ خود بینی — مکھڑے پہ سحر کی شیرینی

یہ کون اٹھا ہے شرماتا

میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان کی اصلی صورت ان بندوں میں جھلکتی ہے، اور اس وقت جو رجحان نظر

آرہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ پچاس برس گزرنے سے پہلے یہی زبان مقبول عام ہوگی۔

اس بحث میں ایک اور بات سامنے آجاتی ہے جو میرے تو علم میں ہے، لیکن ہر اس شخص کو بھی محسوس ہو سکتی ہے جو جوش کا کلام ذرا توجہ سے پڑھے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ جوش کو اپنے کلام پر نظرِ ثانی کرنے کی عادت نہیں ؛ غالباً وہ اس کو شاعرانہ دیانت کا مقتضا سمجھتے ہیں یا اپنے شعر کو قطعیتاً فطری رکھنے کی خاطر ترمیم و تنسیخ روا نہیں رکھتے، لیکن میں اس کو بھی ان کی طبیعت کی بے نظمی اور مزاج کی بے ضابطگی سے تعبیر کرتا ہوں جو فطنت (GENIUS) کا اولین خاصہ ہے مگر ان کی اس عادت کے باعث ان کے یہاں کہیں کہیں تسلسل بیان و خیال زائل ہو جاتا ہے جو محض اشعار کے تقدّم و تاخّر سے رفع ہو سکتا ہے۔ مثلاً ان کی یہی نظم لے لیجئے جس کے چند بند اوپر نقل کئے ہیں : پہلے بند میں کچھ جاگنے اور کچھ سونے کی کیفیت بیان کی گئی ہے پھر دوسرے بند سے لے کر چھٹے بند تک محض تشبیہات و تاثرات نظم ہوئے ہیں۔ مگر ساتویں بند میں پھر "رخ پہ ہے نیند سے بوجھل" آیا ہے اور آٹھواں بند یہ ہے :-

کچھ جاگ رہی کچھ سوتی ہے   ہر موج صبا منہ دھوتی ہے
ناشستہ رُخ یا موتی ہے   انگڑائی سے جز بز ہوتی ہے
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

تسلسل بیان چاہتا ہے کہ جب پہلے بند میں "رین کا جاگا نیند کا ماتا" لکھا گیا ہے تو اس کے بعد آٹھواں بند، پھر ساتواں اور نواں بند آنا چاہئے جس کا ایک مصرعہ ہے "چہرہ پھیکا نیند کے مارے" اور غالباً ان کی اسی عادت کا نتیجہ ہے کہ بعض وقت کوئی ایسا لفظ بھی بندھ جاتا ہے جو تناسب سے باہر ہوتا ہے۔ اسی نظم کے تیسرے مصرعے میں "دھوم مچاتا" نظم ہوا ہے جو اپنی جگہ کیسا ہی شاعرانہ ٹکڑا ہو لیکن نظم کی ساری فضا اور تمام کیفیات اس لفظ کے مفہوم سے متغائر ہیں۔ اور وہ نظم کے پرسکون ماحول میں شور و غوغا کا عنصر شامل کرتا معلوم ہوتا ہے۔ جو خوشگوار نہیں۔

جوش کی اسی بے خیالی کا نتیجہ ہے کہ "شاعر کی نماز" کے پہلے مصرعے میں لفظ "سحر" نظم ہوا ہے، حالانکہ اگر وقت کا تعین یا بیان ناگزیر تھا تو وہ وقت شام کا ہونا چاہئے تھا۔ یہ ایک ایسی فروگذاشت ہے جسے "زمان و مکان" کا اصول گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح "اٹھتی جوانی" کا یہ مصرعہ "خیال کی زد پہ ذوقِ باری" بھی توجہ طلب ہے۔

الغرض جوش ایک فطرت نگار (Poet of Nature) شاعر ہیں اور ان کا کلام ضروری خصوصیاتِ شعری کا حامل ہے لیکن اگر فنونِ لطیفہ کی اس تعریف کو مانا جائے کہ صناعت کا مصرف ہمارے اندر احساسِ انبساط پیدا کرنا اور ہماری روح کے شرف کو ابھارتا ہے تو جوش کی شاعری اس وقت کامیاب ترین شاعری ہے!

جوش کا فلسفہ یا مسلک۔

جوش کا مسلک متعین کرنا انتہائی دشوار کام ہے لیکن کہا جا سکتا ہے کہ وہ "لذتیت" پر گامزن ہیں لیکن اس سے غافل معلوم نہیں ہوتے کہ "لذت" ہے کیا شے؟ "جوانی کی رات" ان کی نہایت مترنم نظموں میں سے ایک ہے، دورِ کیفیاتِ "وصل" کا صناعانہ مرقع ہے، اس کا آخری شعر ملاحظہ ہو:۔

گنبدِ قصرِ عیش میں گونج رہی تھی یہ صدا   رات نہ تھی وہ عیش کی جوش ترا شباب تھا

جوش کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے بعض خیالات کو عقیدے کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ مثلاً یہ خیال کہ ہماری ساری مصیبتیں یادِ ماضی کے باعث ہیں اور جو شے ہمیں ماضی کی یاد دلائے وہی ہمارے رنج کا موجب ہوتی ہے۔ جیسے "نظارۂ ماضی" کا یہ شعر:۔

پڑتا ہے اثر نہ جانے کیونکر   کوئل کی صدا کا حافظے پر

اس خیال کو جوش نے متعدد جگہ مختلف دلپذیر پیرایوں میں لکھا ہے۔ اسی طرح "عمرِ رواں" کا موضوع بھی جوش کو بہت محبوب ہے اور بار بار متنوع اور دلنشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی نظم "کل رات کو ہمیں

ملاحظہ ہو کس پائے کا شعر کہہ دیا ہے ؎

وقت کے ہاتھوں پہ روشن تھیں ابد کی مشعلیں　　ایسی اک منزل میں تھی عمرِ رواں کل رات کو

یا "یومِ بہار" کا یہ شعر ؎

رہ رہ کے اڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ　　کیا جانے کس لباس میں عمرِ رواں ہے آج

چونکہ انتخابِ شعر کا مسئلہ سخت قابلِ حجت اور قطعاً ذوقی چیز ہے، اس لئے میں کوئی انتخاب پیش نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے علاوہ جوش کے کلام میں تو انتخاب مجروح بھی ہوتی ہے۔ اس لئے میں اربابِ ذوق و نظر سے صرف اتنا کہوں گا کہ آپ اس مجموعے میں بہت کچھ سامانِ کیف و لذت پائیں گے جو اُن کے ضخیم مجموعے کا ایک مختصر سا حصہ ہے۔ اور جسے "مُشتے نمونہ از خروارے چند" سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔

لطیف الدین احمد

آگرہ

۵ رفروری ۳۶ء

نگار خانہ

شہریست پُر ظریفاں و ز ہر طرف نگارے
یاراں صلائے عشق است ار میکنند کارے

(حافظ)

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

سنہ ۱۹۲۸ء

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا
رَین کا جاگا، نیند کا ماتا

نیند کا ماتا، دُھوم مچاتا
انگڑائیاں لیتا، بَل کھاتا

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

رُخ پہ سُرخی، آنکھ میں جادُو
بھینی بھینی بَر میں خوشبو

بانکی چِتوَن، سِمٹے ابرو
نیچی نظریں، بکھرے گیسو

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

نیند کی لہریں گنگا جمنی
جِلد کے نیچے ہلکی ہلکی،

آنچل ڈَھلکا، مَسکی ساری
ہلکی مہندی، دُھندلی بِندی

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

ڈوبا ہوا رُخ تابانی میں
انوارِ سحر پیشانی میں

یا آبِ گہر طغیانی میں
یا چاند کا مُکھڑا پانی میں

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

رخسار یہ موجِ رنگینی   کچّی چاندی، سچّی چینی
آنکھوں میں نقوشِ خود بینی   مکھڑے پہ سحر کی شیرینی

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

آنکھیں غلطاں عشرت گاہیں   نیند کی سانسیں جیسے آہیں
بکھری زلفیں، عُریاں باہیں   جان سے ماریں جس کو چاہیں

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

پھیلا پھیلا آنکھ میں کاجل   اُلجھا اُلجھا زلف کا بادل
نازک گردن، پھول سی ہیکل   سُرخ پپوٹے نیند سے بوجھل

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

کچھ جاگ رہی، کچھ سوتی ہے   ہر موجِ صبا منہ دھوتی ہے
ناشُستہ رُخ یا موتی ہے   انگڑائی سے جزبز ہوتی ہے

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

چہرہ پھیکا نیند کے مارے   پھیکے پن میں شہد کے دھارے
جو بھی دیکھے جان کو وارے   دھرتی ماتا بوجھ سہارے

یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

ہلچل میں دِل کی بستی ہے — طوفانِ جُنوں ہیں مستی ہے
آنکھ میں شب کی مستی ہے — اور مستی دل کو ڈستی ہے
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا؟

(سنہ ۱۹۲۵ء)



جوانی کی آمد آمد

گیا لڑکپن، نئی جوانی، نئی اداؤں سے آ رہی ہے
جبیں پہ غنچے کھلا کھلا کر، نظر میں دھومیں مچا رہی ہے

شعاعِ اوّل پڑی ہے گویا چمن میں نرگس کی پنکھڑی پر
رسیلی آنکھوں میں ہے تبسم لبوں پہ سُرخی سی آ رہی ہے

ادائیں پہلو بدل رہی ہیں، نگاہیں کروٹ سی لے رہی ہیں
سنک رہی ہے ہوائے شوخی، حیا کی لَو تھرتھرا رہی ہے

مژہ میں بیدار کر رہا ہے فسوں کو، تیر افگنی کا ارماں
دلوں پہ شبخون کی تمنّا، نظر میں جادو جگا رہی ہے

قمر کے خواب آفریں جہاں میں دمکنے والا ہی مہرِ تاباں
جھلکا رہا ہے نظر دُھندلکا، سحر نگاہیں اُٹھا رہی ہے

ہر ایک تارِ نظر برابر مچل رہا ہے پئے نظارہ
ہر ایک موجِ نفس پیاپے درِ طرب کھٹکھٹا رہی ہے

دراز وشبِ رنگ کاکلوں میں تڑپ رہی ہیں نئی اُمنگیں
صبیح وشاداب عارضوں میں حیاتِ نو مسکرا رہی ہے

ہوا طبیعت کی رُخ بدل کر بھٹک رہی ہے نئی فضا میں
کلی لڑکپن کی مسکرا کر نئے شگوفے کھلا رہی ہے

جھلکتی چاندی پہ کمسنی کی، چڑھا رہا ہے شباب سونا
سفید ہلکی سی چاندنی کو سحر گلابی بنا رہی ہے

گلاب سے عارضوں کی تہ میں شباب تھم تھم کے پرفشاں ہے
نظر فریب انکھڑیوں کی رَو میں شرابِ رس رس کے آ رہی ہے

سکون کی نیم وا گرہ پر چمک رہا ہے خلش کا ناخن
حیات کے دم بخود افق پر نئی کرن جگمگا رہی ہے

جھپک جھپک کر نکیلی پلکیں رباب کے سانچے میں ڈھل رہی ہیں
مچل مچل کر رگوں میں شوخی قدم اُٹھانا سکھا رہی ہے

لچک لچک کر ہر اک قدم پر کمر میں بل پڑ رہے ہیں پیہم
سنک سنک کر ہوائے عشوہ گھنیری زلفیں ہلا رہی ہے

کلام یوں کر رہی ہے گویا چٹک رہی ہیں چمن میں کلیاں

نگاہ یوں اُٹھ رہی ہے جیسے کوئی پری گُنگُنا رہی ہے
لبوں پہ وہ سُرخیاں ہیں جیسے ہلال دامن میں ہو شفق کے
نظر میں ہے وہ خُمار گویا ذرا نیند آ رہی ہے

(سنہ ۱۹۲۵ء)



اُٹھتی جوانی

نئی ہے نامِ خدا جوانی نئی اُمنگیں، نیا زمانہ
جبیں پہ سازِ طرب کی موجیں
نگاہ میں سوزِ شاعرانہ

دلوں پہ مارے ہوئے ہے شبخوں لہو سے ہے سُرخ چشمِ میگوں
ہر اک اشارے میں ایک افسوں
ہر ایک چشمک میں اک فسانہ

نفس میں پھولوں کی سی مہک ہے جبیں پہ خورشید کی دمک ہے
کمر میں تلوار کی لچک ہے
نظر میں بجلی کا آشیانہ

جلو میں مستی و ہوشیاری طواف میں کائنات ساری
جمال کی زو پہ ذوقِ باری
نظر میں شانِ پیمبرانہ

صبیح چہرے پہ نورِ شبنم گداز شانوں پہ زلفِ برہم
ہر ایک موجِ نفس میں پیہم
بلندیوں کی طرف روانہ

ہر اک قدم فتنہ و تلاطم نیازمندی میں بھی تحکّم
پلک جھپکنے میں اک تبسّم
نظر اُٹھانے میں اک ترانہ

جو چاہیں، صہبائے مشک بُو میں تمام عالم کو غرق کر دیں
یہ سُرخ ڈورے یہ مست آنکھیں
کھلا ہے جن میں شراب خانہ

سدھی ہوئی اِس غضب کی پلکیں کہ آنکھ ملتے ہی دل میں ڈوبیں
منجھی ہوئی اِس بلا کی چٹکی
کبھی نہ خالی گیا نشانہ

سکوت میں لحنِ دل رُبائی خطاب میں شانِ کبریائی
جدھر چلی، چل پڑی خدائی
جدھر مڑی، مڑ گیا زمانہ

وہ رُخ پہ طُوفان کیفِ شب کے کہ لیکے انگڑائی مُنھ اندھیرے

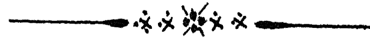
مَلے جو آنکھیں ہتیلیوں سے

ٹپک پڑے بادۂ شبانہ

درِ صنم پر، خدائے اُلفت! قبول فرما مری عبادت

نہ دے مجُھے مسجدوں کی دعوت

کہ دین میرا ہے شاعرانہ



یہ نظر کس کے لیے ہے؟

اے نرگسِ جاناں! یہ نظر کس کے لیے ہے؟ / یہ شعلہ، یہ بجلی، یہ شرر کس کے لیے ہے؟

اے زہرہ جبینوں کے لیے پیکِ ہزیمت! / پیغامبرِ فتح و ظفر کس کے لیے ہے؟

اے تجھ کو ملے عمر مری شامِ بلا کی / یہ زلفِ رسا تا بہ کمر کس کے لیے ہے؟

اے سایۂ کاکل میں جھلکتے ہوئے عارض / ظلمات میں یہ آبِ خضر کس کے لیے ہے؟

اے قامتِ بالا و بلند، اے قدِ موزوں! / یہ سرو، یہ شاخِ گلِ تر کس کے لیے ہے؟

اے دیدۂ مے پرور و اے نرگسِ مخمور! / چھلکا ہوا یہ ساغرِ زر کس کے لیے ہے؟

اے عارضِ ناشستہ و روئے عرق آلود! / یہ شہد، یہ شبنم، یہ شکر کس کے لیے ہے؟

اے تجھ پہ فدا چشمکِ خورشیدِ جہاں تاب / رخ پر یہ تبسم کا اثر کس کے لیے ہے؟

اے زانوئے کونین کی دیرینہ تمنا! / قربان تری زلفوں کے یہ سر کس کے لیے ہے؟

اے حسنِ رخِ روشن و اے جلوۂ کاکل! / یہ ہوش ربا شام و سحر کس کے لیے ہے؟

اے تیرے قدم پر سرِ خوبانِ سرافراز / یہ ناز، یہ دزدیدہ نظر کس کے لیے ہے؟

اے گیسوئے آشفتہ و اے کاکلِ برہم / یہ عمرِ مسیحا و خضر کس کے لیے ہے؟

اے خود سے اُلجھتی ہوئی بدمست جوانی ہر سانس میں یوں زیر و زبر کِس کے لئے ہے؟

اے شوخ، کبھی جوش سے اس نظم کی ضد پر
یہ پوچھ کہ تو خاک بسر کِس کے لئے ہے؟



افشائے راز

کس طرح مانوں کہ اِن نکھرے ہوئے انداز سے
آرہی ہیں آپ ابھی خلوت سرائے ناز سے

سعیِ اخفائے حقیقت میں نہ کیجے اہتمام
عارضِ گلگوں میں رقصاں ہے نسیم "باغِ عام"[1]

چھپ نہیں سکتا ہے اربابِ نظر سے کوئی راز
کیا کوئی خلوت سے آتا ہے بایں طغیانِ ناز؟

حال ابھی کھل جائیگا، بکھرائیے زُلفِ دراز
ساتھ ہیں مُڑ مُڑ کے کتنے دیکھنے والوں کے راز

رہروؤں کی حسرتوں کا ہے نظر میں ارتعاش
جُنبشِ مژگاں کی رو میں کتنے دل ہیں پاش پاش

کتنی تانوں کا اثر ہے رس بھری آواز پر
کتنی سرد آہوں کے پرتو ہیں جبینِ ناز پر

لے رہی ہیں کروٹیں لپٹی ہوئی انوار میں
کتنی للچائی ہوئی نظریں لب ورخسار میں

کتنے سینوں کی تمنّائیں رہینِ اضطرار
اِن گھنی پلکوں کی رنگین چھاؤں میں ہیں بیقرار

اپنے دامن میں لئے ہے کتنی روحوں کی ترنگ
پنکھڑی کی طرح ان ترشے ہوئے ہونٹوں کا رنگ

میں جلو میں، آپ خود دامن جھٹک کر دیکھ لیں
ریشمی آنچل کے چھُو لینے کی کتنی حسرتیں

دیکھنے والوں کی بیتابی کا ہے رُخ پر سُرور
چال میں بیدار ہے اُٹھتی جوانی کا غرور

[1] حیدرآباد کا ایک دلفریب باغ۔

کس قدر شاش و فرحاں ہے جوانی، دیکھیے
اپنے چہرے کی بہارِ کامرانی دیکھیے

کاوشِ اخفا میں اُلٹی اور رسوائی ہوئی
کہیے، کیوں اُٹھتی نہیں اب آنکھ شرمائی ہوئی



یارِ پری چہرہ

(سنہ ۱۹۳۳ء)

وہ یارِ پری چہرہ کہ کل شب کو سدھارا
طوفان تھا، تلاطم تھا، چھلاوا تھا، شرارہ

گُل بیز و گُہر ریز و گُہر بار و گُہر تاب
کلیوں نے جسے رنگ دیا، گُل نے سنوارا

نَوخاستہ و نَورَس و نَوطلعت و نَوخیز
وہ نقش جسے خود یدِ قدرت نے اُبھارا

خوں ریز و کم آمیز و دل آویز و جنوں خیز
ہنستا ہوا مہتاب، دمکتا ہوا تارہ

خوش چشم و خوش اطوار و خوش آواز و خوش اندام
اک خال پہ قربان سمرقند و بخارا

گُل پیرہن و گُل بدن و گلرخ و گلرنگ
ایمان شکن، آئینہ جبیں، انجمن آرا

صبحِ گُلِ نوخاستہ و شامِ شگوفہ
مر رہنے کا سامان، تو جینے کا سہارا

آئینۂ رخسار پر اک خالِ سیہ تاب
پیشانیٔ گل رنگ پر آنچل کا کنارا

آنکھوں کے جھکنے میں تقاضائے تلطّف
پلکوں کے جھپکنے میں تمنّائے مُدارا

وہ لب کہ مہِ نَو کی دھڑکنے لگے چھاتی
وہ آنکھ کہ موتی کو نہ ہو صبر کا یارا

کلیوں کی نمائش میں اگر ہو متبسّم
ہو اُسکے ہی ہونٹوں کی طرف کثرتِ آرا

نظریں جو اٹھادے تو لرزنے لگے خورشید
ابرو کو جو بل دے تو ہو مہتاب دوپارا

اللہ ری ملبوس کی تابش شبِ مہ میں
سلما جو دمکتا تھا، جھمکتا تھا ستارا

تھا میری نگاہِ طرب آموز کا پابند
رنگِ لب و رخسار کا چڑھتا ہوا پارا

صندل کی دمک تھی عرق آلودہ جبیں پر
یا نہرِ گلستاں میں تڑپتا ہوا تارا

نغموں کے تلاطم سے تھا جنبش میں لبِ لعل
لہروں کے تھپیڑوں میں تھا دریا کا کنارا

ہر سانس میں اپنے ہی پہ پیچیدہ جوانی
ہر گام پہ بکھری ہوئی زلفوں کا نظارا

اس طرح تبسم میں تکلّم کی گھلاوٹ
جس طرح مئے تند کی تلخی ہو گوارا

کاکل کے خم و پیچ سے افشاں کا جھلکنا
ظلمات سے تھا چشمۂ حیواں کا اشارا

سرشار جوانی تھی کہ امڈے ہوئے بادل
شاداب تبسم تھا کہ جنت کا نظارا

زلفیں تھیں کہ ساون کی مچلتی ہوئی راتیں
شوخی تھی کہ سیلاب کا مڑتا ہوا دھارا

رخ بات کا اقرار سے انکار کی جانب
جس طرح ہرن دشت میں بھرتا ہوا ترارا

اللہ کرے وہ صنمِ دشمنِ ایماں
مچلے کسی شب جوشؔ کے پہلو میں دوبارا

نیچی نگاہیں

(سنہ ۱۹۲۵ء)

آہ یہ نیچی نگاہیں، اے نگارِ شرمگیں
عشق اُس کافرِ حیا کی تاب لا سکتا نہیں

یہ شہابی رنگ، نازک جلد میں رخسار کی،
خون کا یہ رقص، تہ میں عارضِ گلنار کی

سُرخ آنچل کا ڈھلک جانا یہ سر سے بار بار
دونوں ہاتوں سے چھپا لینا یہ مُنھ بے اختیار

سرنگوں ہیں پھول، سکتے میں ہے پیمانے کا رنگ
اُف یہ نم آلود رخساروں پہ شرمانے کا رنگ

عارضِ گلرنگ پر یہ پھول سا کھلتا ہوا
یہ تبسم جو طلوعِ صبح سے ملتا ہوا

گفتگو یہ، سر جھکا کر شرمگیں انداز سے
یہ گرہ ہر لفظ میں رُکتی ہوئی آواز سے

ہر نفس، کڑیاں سی کھلنا سانس کی زنجیر میں
کہتے کہتے کچھ یہ رک جانا ترا تقریر میں

لب کو یوں جنبش سی ہونا نطقِ شرم آمیز سے
پنکھڑی جس طرح مڑ جائے ہوائے تیز سے

جمنا کے کنارے

(سنہ ۱۹۲۸ء)

خورشید طلوع ہو رہا ہے
افسانہ شروع ہو رہا ہے

جلووں کی ہے چھوٹ خار و خس پر
رقصاں ہے شعاع ہر کلس پر

رہ رہ کے جھلک رہا ہے پیہم
ہر ذرّۂ خاکدانِ عالم

گردوں کی جبیں دمک رہی ہے
پودوں کی کمر لچک رہی ہے

جاگے ہیں طیور چہچہاتے
چونکے ہیں حسین رسمساتے

مکھڑوں پہ لئے بصد تجلّی
شبنم کی نمی، صبا کی خنکی

پونچھیں منہ کو اگر ذرا بھی
رومال میں چھوٹ آئے سرخی

رگ رگ میں ہے محو پرفشانی
وارستہ مزاج نوجوانی

پھوٹی ہے کرن جو تلملاتی
شبنم کی دھڑک رہی ہے چھاتی

لائی ہے نسیم بوئے گیسو
گلیوں میں مچل رہی ہے خوشبو

اس عالمِ رنگ و بُو کے اندر
میدان سے اک ذرا سا ہٹ کر

اک قصر، قریبِ رودِ جمنا — لہروں کو بنا رہا ہے بینا

یوں قصر کا عکس ہے سرِ آب — ارماں جیسے ہوں دلِ بیتاب

اِس قصر کے بام پر کُھلے سر

اِک زہرہ جبیں و ماہ پیکر

نوخیز، حسیں، بلند بالا — اوڑھے ہوئے سُرمئی دوشالا

افسوں بہ نگاہ و زلف بر دوش — غرفے میں کھڑی ہوئی ہے خاموش

فردوس کے در کئے ہوئے باز — ٹیکے ہوئے کہنیاں بصد ناز

رنگین کلائیوں کو جوڑے — چہرے کو ہتیلیوں پہ رکھّے

گلدان میں پھول ہنس رہا ہے — قرآں ہے کہ رحل پر دھرا ہے

طوفان ہیں دل ربائیوں کے — مُڑنے میں سُبک کلائیوں کے

آنکھوں میں ہے تابِ صبحِ روشن — ہونٹوں میں شگفتگی کا مسکن

انجم کی طرح جبیں پہ ٹیکا — خورشید، سپہرِ کمسنی کا

کانوں میں نظر فریب بُندے — اے کاش کوئی یہ پھول چُن دے

چہرے پہ ہے گرم لن ترانی، — الھڑ، کافر، نئی جوانی

اک سانس میں نیند سے گرانبار — اک سانس میں بیقرار و بیدار

ایک سانس میں پاس آ رہی ہے
ایک سانس میں دُور جا رہی ہے

اُلجھی، بکھری سیاہ زُلفیں
چبھتی ہوئی نیند انکھڑیوں میں

دریا کی ہوا جو کھا رہی ہے
بشاش ہے مُسکرا رہی ہے

اور یوں کہ قریبِ لب ذرا سا
عارض میں پڑا ہوا ہے حلقہ

اس حلقۂ دلنشیں کے اندر
غلطیدہ ہیں نازکے سمندر

یہ شانِ جمال، اللہ اللہ
انسان کے بھیس میں شبِ ماہ

یہ حسن، یہ دل کشی، یہ عالم
سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے شبنم

جس خاک سے گزرے، کیمیا ہو
جس بُت پہ نظر کرے، خدا ہو

شاعر کا بھی اک حقیر سجدہ
اے دشمنِ دیں! قبول فرما

"حُسنِ تو ہمیشہ در فزون باد
رویت ہمہ سال لالہ گون باد
قدِّ ہمہ دلبرانِ عالم
در خدمتِ قامتت نگون باد"
(حافظ)

گنگا کے گھاٹ پر

(سنہ ۱۹۲۲ء)

بڑھائے سُرخیِ عارض ہوائے صحرا سے
نہایا کون چلا آرہا ہے گنگا سے

سِرا دُلائی کا سر پہ، نظر جھکائے ہوئے
دبائے دانتوں میں آنچل، بدن چرائے ہوئے

لبوں پہ مہرِ خموشی، خموشیوں میں خطاب
کمر میں لوچ، جبیں پر دمک، نظر میں شراب

قدم قدم پہ تمنّائیں دِلستانی کی
رُخِ شگفتہ پہ طغیانیاں جوانی کی

شراب ناب لئے نرگسی کٹوروں میں
لہو چمن کا رواں سُرخ سُرخ ڈوروں میں

درازِ زُلف میں جادو، سیاہ آنکھ میں مدہ
نسیمِ صبحِ بنارس، ہلالِ شامِ اودھ

ہوائے صبح سے روشن چراغِ سیم تنی
شگفتہ، غسلِ سحر سے مزاجِ گُل بدنی

نظر نہ آئے وہ چہرے پہ چادرِ آبی
بیاضِ چشم میں گُل کاریٔ شکر خوابی

خنک نسیم سی اُبھری ہوئی نقوشِ شباب
صباحتیں ہیں کہ برسات کی شبِ مہتاب

عجب حُسن ٹپکتا ہے چشم و ابرو سے
مہک رہی ہے ہوا کمسنی کی خوشبو سے

مقابلہ جو کرے کوئی، چاند پھیکا ہے
جبینِ شوخ پہ صندل کا سُرخ ٹیکا ہے

نمی ہے زُلف میں، اشنان کر کے نکلی ہے
یہ کسکی موت کا سامان کر کے نکلی ہے؟

لبوں پہ کھیل رہا ہے اثر نہانے کا — گماں ہوتا ہے ہر بار مُسکرانے کا

سیاہ زُلف پر آنچل خفیف آبی ہے — برہنہ پا ہے تو ہر نقشِ پا گلابی ہے

مرلطیف سی کوئی کاش یوں ہو گرمِ خطاب — کہ وقتِ صبح ہے اے دخترِ شبِ مہتاب

ازل کے دن سے دَرِ حسن کا بھکاری ہوں
اِدھر بھی ایک نظر، میں ترا پجاری ہوں



مالن

(سنہ ۱۹۲۳ء)

آرہی ہے باغ سے مالن وہ اٹھلاتی ہوئی
مسکرانے میں لبوں سے پھول برساتی ہوئی

بار بار آنکھیں اٹھاتی، سانس لیتی تیز تیز
رس جوانی کا گھنی پلکوں سے ٹپکاتی ہوئی

پاؤں رکھتی ناز سے، شبنم کے قطروں کی طرح
سبزۂ خوابیدۂ گلشن کو چونکاتی ہوئی

آستینوں میں سے جھلکاتی ہوئی باہوں کا رنگ
کاکلوں میں سے "کرن پھولوں" کو جھمکاتی ہوئی

نغمۂ گیسو سے ہر جھونکے میں بھرتی بوئے گل
نقش پا سے ہر روش میں خون دوڑاتی ہوئی

نصف آنکھیں بند کرکے سونگھتی پھولوں کے ہار
ہر نفس بیہوش ہو کر ہوش میں آتی ہوئی

چھیڑ خود اپنے ہی سے کرتی ہوئی مستانہ وار
ہر قدم پر کاکلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی

اینڈتی، مڑتی، خود اپنی کمسنی سے کھیلتی
بھاگتی، رکتی، ٹھٹکتی، بال بکھراتی ہوئی

گنگناتی، مسکراتی، لڑکھڑاتی، جھومتی
مثل بر اپنے ہی پر خود پیچ و خم کھاتی ہوئی

پھول ہیں آنچل میں، آنچل لوٹتا ہے دوش پر
اور آنچل پر گھنی زلفیں ہیں لہراتی ہوئی

ہائے کیا گوری کلائی میں ہے لچھا دلفریب
ہائے کیا چاندی کی ہیکل ہے ستم ڈھاتی ہوئی

جوش پوچھے کوئی اس گل پیرہن مالن کا نام
آرہی ہے غنچۂ دل کو جو چٹکاتی ہوئی

جامن والیاں

(سنہ ۱۹۲۵ء)

روح شاعر آج پھر ہے وجد میں آئی ہوئی
آم کے باغوں پہ ہے کالی گھٹا چھائی ہوئی

مست بھونرا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں
روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی

غنچہ غنچہ اپنے فطری رنگ میں ڈوبا ہوا
پتی پتی، اپنے اصلی رنگ پر آئی ہوئی

خارِ صحرا، فیضِ ابر و باد سے نکھرے ہوئے
خاکِ گلشن، موجِ رنگ و بو سے اترائی ہوئی

بہہ رہی ہیں ندیاں، ساون کے نغموں کی طرح
گا رہی ہیں کوئلیں، موسم کی تڑپائی ہوئی

آ رہی ہیں ناز سے نوخیز جامن والیاں
انکھڑیوں میں اجنبیت، چال اٹھلائی ہوئی

عمر کے نشے سے کچھ کچھ نیند میں ڈوبی ہوئی
برق کی ہلچل سے کچھ کچھ ہوش میں آئی ہوئی

ابر میں لچکے ہوئے پودوں کا دست و پا میں لوچ
دھوپ کے تپتے ہوئے کھیتوں کی سنولائی ہوئی

پھر رہی ہیں تربتر گلیوں میں سوتی جاگتی
منہ اندھیرے ہی سے بوچھاروں کی چونکائی ہوئی

دونوں ہاتوں سے سنبھالے ہیں سر و ٹوکرے
ہات انگڑائی کی صورت، آنکھ شرمائی ہوئی

ہائے یہ بکھری ہوئی زلفیں، یہ کالی جامنیں ‏ ہائے یہ گلشن، یہ ساونکی گھٹا چھائی ہوئی

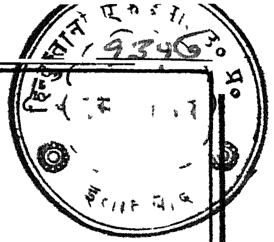
پائے نازک، راہ کے پانی سے یہ بھیگے ہوئے ‏ پنڈلیاں، زورِ جوانی سے یہ بل کھائی ہوئی

ہائے یہ پچتی ہوئی نوعمر جامن والیاں ‏ عاقبت اندیش دہقانونکی سمجھائی ہوئی

یہ جھجک اُٹھنا جوانوں کی نظر سے بار بار ‏ یہ نگاہیں، شہر کی گلیونمیں گھبرائی ہوئی

ہائے یہ کافر مناظر ہوش میں رکھتے نہیں
جوشؔ ان فصلونمیں اکثر اپنی رسوائی ہوئی،

——— ××× ———



جنگل کی شاہزادی

(سنہ ۱۹۲۲ء)

پیوست ہے جو دل میں، وہ تیر کھینچتا ہوں
اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

گاڑی میں گنگناتا مسرور جا رہا تھا
اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا

تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی
لیلیٰ ستار اپنا گویا بجا رہی تھی

خورشید چھپ رہا تھا رنگین پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں

کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں
تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں

لہروں میں کوئی جیسے دل کو ڈبو رہا تھا
میں سو رہا ہوں، ایسا محسوس ہو رہا تھا

اک موج کیف پرور دل سے گزر رہی تھی
ہر چیز دلبری سے یوں رقص کر رہی تھی

تھیں رخصتی کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری

کانٹوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے
دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے

زاہد فریب، گلرخ، کافر، دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رخ، نوخیز، حشر ساماں

خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر
نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسوں گر

کافر ادا، شگفتہ، گل پیرہن، سمن بو　　　سروِ چمن، سہی قد، رنگین جمال، خوش رو
گیسو کمند، مہوش، کافور فام، قاتل　　　نظارہ سوز، دلکش، سرمست، شمعِ محفل
ابرو ہلال، مہ گوں، جاں بخش، روح پرور　　　نسریں بدن، پری رخ، سیمیں عذار، دلبر
آہو نگاہ، نورس، گلگوں، بہشت سیما　　　یاقوت لب، صدف گوں، شیریں، بلند بالا
غارتگرِ تحمل، دل سوز، دشمنِ جاں　　　پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں
گلشن فروغ، کمسن، مخمور، ماہ پارا　　　"دلبر کہ در کفِ او موم است سنگِ خارا"
ہر بات ایک افسوں ہر سانس ایک جادو　　　قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو
صحرا کی زیب و زینت، فطرت کی نورِ دیدہ　　　برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ
چہرے پہ رنگِ تمکیں، آنکھوں میں بیقراری　　　ایمائے سینہ کوبی، فرمانِ بادہ خواری
لو ہا تپانے والی جلوؤں کی ضو فشانی　　　سکتے بٹھانے والی اٹھتی ہوئی جوانی
ڈوبے ہوئے سب اعضا حسنِ مناسبت میں　　　پالی ہوئی گلوں کے آغوشِ تربیت میں
حسنِ ازل ہے غلطاں شاداب پنکھڑی میں　　　یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں

حوریں ہزار دل سے قربان ہو گئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر "انسان" ہو گئی ہیں

چینِ ستمگری سے نا آشنا جبیں ہے　　　میں کون ہوں؟ یہ اسکو معلوم ہی نہیں ہے

ہر چیز پر نگاہیں حیرت سے ڈالتی ہے | رہ رہ کے اُڑنے والی چادر سنبھالتی ہے

آنچل سنبھالنے میں یوں بل سے کھا رہی ہے
گویا ٹھہر ٹھہر کر انگڑائی آ رہی ہے

کچھ دیر تک تو میں نے اُسکو بغور دیکھا | غش کھا رہی تھی عقبیٰ، چکرا رہی تھی دُنیا
گاڑی سے پھر اُتر کر اُس کے قریب آیا | طوفانِ بیخودی میں پھر یہ زباں سے نکلا
اے درسِ آدمیّت، اے شاعری کی جنّت | اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت
اے روحِ صنفِ نازک، اے شمعِ بزمِ عالم | اے صبحِ روئے خنداں، اے شامِ زلفِ برہم
اے تو کہ تیری نازک ہستی میں کام آئی | قدرت کی انتہائی تخیّلِ دلربائی
چشم و چراغِ صحرا، اے نورِ دشت و وادی | رنگیں جمال دیوی، جنگل کی شاہزادی!
بستی میں تو جو آئے، اک حشر سا بپا ہو | آبادیوں میں ہلچل، شہروں میں غُلغلہ ہو
زندانِ بادہ کش کے ہاتھوں سے جام چھوٹیں | تسبیح شیخ اُلجھے، توبہ کے عزم ٹوٹیں
نظروں سے اتقا کے رسم و رواج اُتریں | زہّاد کے عمامے، شاہوں کے تاج اُتریں
آنکھیں ہوں اشک افشاں، نالے شرر فشاں ہوں | کیا کیا نہ شاعروں کے ملبوس دھجیاں ہوں
شہروں کے مہوشوں پر اک آسمان ٹوٹے | پروردۂ تمدّن عشووں کی نبض چھوٹے
اس سادگی کے آگے نکلیں دلوں سے آہیں | جھک جائیں دلبروں کی خود ساختہ نگاہیں

تیری ادا کے آگے شرما کے منہ چھپائیں — ناپے ہوئے کرشمے، تولی ہوئی ادائیں

تیری نظر کی رَو سے ہو جائیں خستہ و گم — مشق و مزاولت کے پالے ہوئے تبسّم

امن و اماں کے رخ کو بے آب و رنگ کر دے — دُنیا کو حسن تیرا میدانِ جنگ کر دے

کتنی ہی قسمتوں کے بدلے فلک نوشتے — خون اور دوستی کے کٹ جائیں کتنے رشتے

تصنیف ہوں ہزاروں چُھبتے ہوئے فسانے — اِن انکھڑیوں کی زد پر کانپیں شراب خانے

تیرے پُجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا — اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا

یہ بن، یہ گُل، یہ چشمے مجھ سے قریب ہوتے — شاعر کے زیرِ فرمان سب رقیب ہوتے

کیوں، میری گفتگو سے حیرت فروش کیوں ہے؟ — اے رمز ہوں کی دیوی اِتنی خموش کیوں ہے؟

بجنے لگیں وفا کی محفل میں شادیانے — ہاں دے لبوں کو جنبش اے سرمدی ترانے!

یوں چُپ ہے، مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے — یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

سُننا تھا یہ کہ ظالم اِس طرح مُسکرائی
فریاد کی نظر نے ارمان نے دی دُہائی

عشوہ جبیں پہ لیکر دل کی اُمنگ آیا — چہرے پہ خون دوڑا آنکھوں میں رنگ آیا

شرما کے آنکھ اُٹھائی، زلفوں پہ ہات پھیرا — اتنے میں رفتہ رفتہ چھانے لگا اندھیرا

چمکا دیا حیا نے ہر نقشِ دلبری کو — دانتوں میں یوں دبایا چاندی کی آرسی کو

سُنکر مری مچلتی آنکھوں کی داستانیں ۔ اُسکی نگاہ میں بھی غلطاں تھیں زبانیں

شرما کے پھر دوبارہ زلفوں پہ ہات پھیرا ۔ دیکھا تو چھا چکا تھا میدان پر اندھیرا

کچھ جسم کو چُرایا، کچھ سانس کو سنبھالا ۔ کاندھے پہ نرم آنچل انگڑائی لیکے ڈالا

تاریک کرکے، میری آنکھوں میں اک زمانہ ۔ جنگل سے سر جُھکا کر ہونے لگی روانہ

ہونے لگی روانہ، ارمان نے سر جھکایا ۔ دل کی مثال کانپا رہ کے بن کا سایا

بیہوش ہو چلا میں، سینے سے آہ نکلی ۔ اتنے میں رات لیکر قندیلِ ماہ نکلی

مُڑ کر جو میں نے دیکھا، اُمید مر چکی تھی
پٹری چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

اشکِ اوّلیں

خوشا وہ دن کہ شادابی تھی دل میں جب لڑکپن کی
بہاریں لوٹتی تھی جب وہ میرے ساتھ گلشن کی

کلی وجود کی کھلتی تھی خنک جاڑوں کی راتوں میں
انگیٹھی کے کنارے نیند اڑ جاتی تھی باتوں میں

ہوائے سرد کے جھونکے ہمیں بیخود بناتے تھے
فرشتوں کی طرح شفاف چشموں میں نہاتے تھے

جب اوجِ چرخ پر ساون کے بادل گھر کے آتے تھے
ہوائے نرم میں کیا کیا نہ ہم دھومیں مچاتے تھے

پتن پہروں نیم کے نیچے اُسے جھولا جھلاتا تھا
وہ گاتی تھی، مگر اُسکو نہ کچھ آتا، نہ جاتا تھا

خفا ہوتے تھے تو اک دوسرے کا منھ چڑھاتے تھے
گھروندے صحن میں بن بن کے اکثر ٹوٹ جاتے تھے

نہ دن کو دل دھڑکتا تھا، نہ شب کو آنکھ روتی تھی
محبت اتنی نازک تھی کہ مطلق حس نہ ہوتی تھی

کسے معلوم تھا، اک روز ہو گی سرگرانی بھی
دبے پاؤں چلی آتی ہے تیزی سے جوانی بھی

زمیں پھرتی رہی، ذرات میں ہوتی رہی گردش
اُسی کے ساتھ محسوسات میں ہوتی رہی گردش

بھرے ظالم کے شانے کشتیٔ طفلی کے کھینے سے
کلی کھلتی رہی جلووں کی پیہم سانس لینے سے

جوانی، سینۂ طفلی میں اٹھلاتی رہی برسوں
کوئی مبہم تمنّا دل کو گرماتی رہی برسوں

مچلتا سا رہا ذوقِ تماشا آنکھ کے تل میں
تڑپ بھرتی رہی اک غیر محسوس آرزو دل میں

زمینِ برف میں تخمِ شرر بوتی رہی بجلی
تنِ نازک میں رفتہ رفتہ حل ہوتی رہی بجلی

جلا ہوتی رہی پردے ہی میں زُلفِ پریشاں پر
زمرد کے ورق چڑھتے رہے رخسارِ تاباں پر

لبِ رخسار کو دیتی رہی درسِ درخشانی
دلِ نازک کے نامعلوم ارمانوں کی جولانی

(۲)

نہ دیکھی تھی ابھی دُنیا، سمجھ لیتا میں یہ کیونکر
کہ کچھ دن میں سفر سے کوئی پلٹے گا جواں ہوکر

نظر اب جو اُٹھائی تو یکایک دیکھتا کیا ہوں
کہ میں تنہا ہزاروں بجلیوں کی زد پہ بیٹھا ہوں

وفورِ ناز سے چھُٹنے پہ ہیں نبضیں محبت کی
شناسائی کے ماتھے پر ہیں لہریں اجنبیت کی

نظر میں مضمحل ہیں چشمکیں اگلے زمانے کی
لبِ نازک پہ ہے سکتے میں عادت مسکرانے کی

خلاف رسم یہ عالم جو میرے روبرو آیا
معاً آنکھوں میں اشکِ اوّلین آرزو آیا

نظر پہلے تو آئی اک چمک آنسو کے محمل میں
یکایک کھُل گیا پھر اک دریچہ سارے دل میں

حریمِ جاں کی میں نے اُس دریچے سے زیارت کی
نظر آئی مجھے خونیں کفن دیوی محبت کی

بقا کے پھول کو تابوت پر کھلتے ہوئے دیکھا — اجل کو زندگانی سے گلے ملتے ہوئے دیکھا
صدائیں گونج اٹھیں دل میں ہزاروں آبشاروں کی — ہوا چلنے لگی سینے میں لافانی بہاروں کی
معاً اک آگ سی سوزِ دروں نے دل میں بھڑکائی — تمنا کسمسائی، غم نے لی سینے میں انگڑائی
مرے پہلو میں پہلی مرتبہ اک پھانس سی کھٹکی — گھٹا سی چھا گئی دل پر، کلی سی روح میں چٹکی
نرالا خوف، انوکھی کشمکش، ناآشنا ہلچل — گرجتے ہوں کہیں کچھ دور جیسے خواب میں بادل
دکھائی اک نئی دنیا نے کچھ یوں بزم آرائی — یکایک آئے چشمِ کور میں جس طرح بینائی

جہاں کا ذرّہ ذرّہ دیدۂ حیراں نظر آیا
میں خود اپنے کو اک بدلا ہوا انساں نظر آیا

وہ بھڑکی آگ سینے میں، رگ و پے کو تپا ڈالا — زباں سے یہ مری بیساختہ نکلا "جلا ڈالا"
یہ سنتے ہی جبینِ حسن پر پہلی شکن آئی — جلو میں سیکڑوں جلوے لیے گویا دلھن آئی
غرورِ حسن نے بگڑے ہوئے انداز سے دیکھا — نیازِ عشق صدقے ہو گیا اس ناز سے دیکھا
کہا کچھ زیرِ لب زلفیں ہٹا کر روئے تاباں سے — مہک دوشیزگی کی آئی لعلِ عطر افشاں سے
جوانی گومگو میں پڑ کے غش کھانے لگی گویا — جماہی کی طرح لی سانس، نیند آنے لگی گویا
نظر میں آ گیا رنگِ تمنا کھنچ کے سینے سے — گلابی ہو گیا کچھ اور بھی چہرہ پسینے سے
بچا کر آنکھ پرکھا اس نے میرے دل کی حالت کو — ادا سے پھیر کر آنکھوں پر انگشتِ شہادت کو

اُٹھائیں انکھڑیاں رُخ سے ہٹا کر کاکلِ مشکیں
نظر میں یادِ ایّامِ طرب نے کروٹیں بدلیں
یکایک پہنچ گیا دل میں تخیّل کج ادائی کا
لبوں پر آ چلا کچھ کچھ تبسّم دلربائی کا
خفیف اک رنگِ اُلفت حُسن کے پندار میں جھلکا
تصوّرِ صحبتِ دیرینہ کا رُخسار میں جھلکا
ستم ہی ڈھا دیا بھولے سے عریاں ہو کے باہوں نے
بقدرِ یک نظر تقریر کی نیچی نگاہوں نے
گلے پر ہمدمِ طفلی کے تیغ خوں فشاں پھیری
زرا سا مسکرا کر سُرخ ہونٹوں پر زباں پھیری

مٹا ڈالا ہے جس ظالم نے میری شادمانی کو
الٰہی! خیر کی توفیق دے اُس کی جوانی کو

کوہستانِ دکن کی عورت

یہ اُبلتی عورتیں اِس چلچلاتی دُھوپ میں
سنگِ اسود کی چٹانیں، آدمی کے رُوپ میں

واہ کیا کہنا ترا، اے حُسنِ ارضِ آفتاب !
یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے سنگیں شباب !

ہر سراپا، بت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل
اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال، جیسے تُند چشمے، تیوریاں، جیسے غزال
عارضوں میں جامنوں کا رنگ، آنکھیں ہشیال

عورتیں ہیں، یا برسات کی راتوں کے خواب
پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفاں خیز پتھریلا شباب

یہ جواں چہرے، یہ چہروں میں برنائی کا جوش
تُو کہے، آہن میں کھودے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم ہیں کچھ اسقدر ٹھوس، الحفیظ والاماں
لیجیے چٹکی، تو چھل جائیں خود اپنی اُنگلیاں

مچھلیاں شانوں کی اُبھری سی، بٹی سی کاکلیں
آہنِ فولاد کے پٹھے، سلاخوں کی رگیں

دید کے قابل ہے اِن کا فربہوں کا رنگ رُوپ
کھپ چکی ہے جس میں بارش، ڈس چکی ہے جسکو دھوپ

اِن بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی، الاماں
پتھروں کا دُودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں

کنکروں کے فرش پر دُنیا سُلاتی ہے جنھیں
آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنھیں

کیا خبر کتنے دلوں کی جوشش پامالی ہوئی
ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

حُسنِ بیمار

کیا غضب ہے حُسن کے بیمار ہونے کی ادا
جیسے کچّی نیند سے بیدار ہونے کی ادا

اِنکسارِ حُسن، پلکوں کے جھپکنے میں نہاں
نیم وا بیمار آنکھوں سے مروّت سی عیاں

جُنبشِ مژگاں میں غلطاں سازِ غم کا زیر و بم
خامُشی میں پُرفشاں ایفائے پیماں کی قسم

احترامِ عشق کی رُوداد دلنشیں آواز میں
ایک پھیکے پن کا سنّاٹا ادائے ناز میں

الاماں آنکھوں کی نیم افسردہ سی افسوں گری
ایک دُھندلا سا تبسّم، اک تھکی سی دلبری

چوڑیاں ڈھیلی، دُلائی پُر شکن، ماتھے پہ ہات
لب پہ خُشکی، رُخ پہ سوندھا پن، نظر میں التفات

ہلکی ہلکی جھلکیاں رُخسار پر یوں نور کی
جیسے گُل پر صبحِ کاذب کی سُہانی چاندنی

لے رہا ہے کروٹیں عارض میں یوں رنگِ شباب
جس طرح موجِ خراماں پر ضیائے ماہتاب

حُسن یوں کھویا ہوا سا بزمِ محسوسات میں
جیسے دو نو وقت ملتے ہوں بھری برسات میں

یوں ہے اک روشن نمی سی چشمِ سحر انداز میں
صبح کو شبنم ہو جیسے معرضِ پرواز میں

جیسے کُہرے میں کوئی تابندہ منظر دُور کا
جیسے پچھلی رات کے سینے پہ ڈورا نور کا

ایسے اِضمحلال پر دُنیا کی برنائی نثار
ایسی بیماری پر اعجازِ مسیحائی نثار

جوانی کا تقاضا

(۱۹۳۳ء)

مُنھ اندھیرے تھی جب آویزش سی مِہر و ماہ میں
چھاؤں میں تاروں کی کچی نیند سے چونکی ہوئی
رنگ سا اک، شہر پیما پائے بے پاپوش پر
چال اٹھلائی ہوئی، گردن کا خم مستانہ وار
لیکن اس عالم میں بھی اے محوِ فطرت ہمنشیں!
دیدنی ہے تلخ پیشے کا یہ اندازِ طرب
سچ ہے طوفانِ جوانی کو دبا سکتا ہے کون؟

مہترانی اک نظر آئی مجھے کل راہ میں
اک قدم پر جاگتی، اک گام پر سوتی ہوئی
رُخ پہ نیندیں، مَل گئی ساری کا پلّو دوش پر
انکھڑیوں میں تنگ کوچوں کے تصوّر کا غبار
غم کا کوئی خار، پیشانی کے پھولوں میں نہیں
اک چمک سی انکھڑیوں میں، ایک لے سی زیرِ لب
سرِ شباب شعلہ پرور کا جھکا سکتا ہے کون؟

مہترانی ہو کہ رانی، گنگنائیگی ضرور
کچھ بھی ہو جائے، جوانی گنگنائیگی ضرور!



شغل کا اثر

(سنہ ۱۹۳۳ء)

دیکھتا تھا روز اک عورت کو میں وقتِ سحر
بُورئیے بُنتے ہوئے پتلی گلی کے موڑ پر

سر سے پا تک بستۂ محویتِ اندوہناک
خال و خد پر ظلمتِ سنجیدگی و انہماک

شوق اُس عورت میں رُوحِ ناز پاتا ہی نہ تھا
دل لُبھانے کا کوئی انداز پاتا ہی نہ تھا

لیکن اک دن صُبح کو، چھائی ہُوئی تھی جب گھٹا
موڑ پر میں دفعتہً حیران ہو کر رہ گیا

دیکھتا کیا ہوں وہی "عورت" بصد انداز و ناز
چھپی ماتھے پہ بکھرائے ہوئے زُلفِ دراز

عشوۂ ترکانہ کے ساتھ، ایک ظرفِ تنگ میں
دے رہی تھی ڈوب ساری کو گلابی رنگ میں

دل پکارا آج کیسی آگ سی بھڑکی ہے یہ
مجھ پر اُس دن یہ کھلا "عورت" نہیں "لڑکی" ہے یہ!

شاعر کی نماز

(سنہ ۱۹۲۷ء)

اک زنِ کم رُو، سحر کو آئینے کے سامنے ہات میں کنگھی لیے، کھڑکی کا پٹ کھولے ہوئے
دیر سے سُلجھا رہی تھی کاکلِ پُر پیچ و خم لے رہا تھا آنکھ میں لہریں مگر سفاکِ غم
آئینے سے کہہ رہی تھی چشمِ حسرت آفریں اس کُرے پر کوئی میرا پوچھنے والا نہیں
کس قدر قحطِ خریداری نے ہلکا کر دیا تجکو اے میری جوانی کی متاعِ بے بہا!
یہ مرے گیسو، یہ لب، یہ چشم، یہ رُخ، یہ دہن آہ یہ برنائیاں، اور اس قدر رنج و محن

اس زمیں پر جستجوئے جلوۂ رنگیں نہیں
پھول تو موجود ہے، لیکن کوئی گلچیں نہیں

اس سماں سے قلبِ شاعر ہو گیا زیر و زبر اور کچھ اس پیار سے ڈالی بناوٹ کی نظر
عارضِ شب رنگ پر سُرخی نمایاں ہو گئی ہات قبضے پر گیا، تلوار عریاں ہو گئی
آنکھ کے پردوں میں گویا شہد سا گھُلنے لگا سانس کچھ اس ناز سے لی، رنگ رُخ کھُلنے لگا
خشک ہونٹوں پر تبسم رنگ برسانے لگا خال و خد کی گتھیاں پندار سُلجھانے لگا

عشوہ، سُرخی سی، سیہ چہرے پہ دوڑانے لگا
ظلمتوں میں آبِ حیواں ناز فرمانے لگا

اِک زرا گہرا سا ہو کر ہر نفَس آنے لگا
ناز سے انگڑائی لی، آنکھوں میں رَس آنے لگا

صُبح کی تنویر، شبنم سے گلے مِلنے لگی
مَس کیا بادِ سحر نے، اور کلی کھِلنے لگی

ہات میں، صیّاد، کاندھے سے کماں لینے لگا
چشم و ابرو میں غرور انگڑائیاں لینے لگا

خود بخود آرایشِ کاکل سے شرمانے لگی
دست و پا میں ایک ہلکی لہر سی آنے لگی

دیکھ اے زاہد! اسے کہتے ہیں شانِ سوز و ساز
شاعرانِ پاک دل اس طرح پڑھتے ہیں نماز!

خمریات

خیز و در کاسۂ زر آبِ طربناک انداز
پیش از آنے کہ شود کاسۂ سر خاک انداز

(حافظ)

یومِ بہار

اے ہمنشیں! وہ جوشِ مئے ارغواں ہے آج
صہبا کی ایک بوند میں کون و مکاں ہے آج

ہر غنچہ کہ رقص کناں ہے بہ طرحِ نَو
چشم و چراغِ سلسلۂ قدسیاں ہے آج

جس پر نثار موجۂ تسنیم و سلسبیل
بکھری ہوئی وہ کاکلِ عنبر فشاں ہے آج

اللہ رے سیلِ نغمہ و طوفانِ رنگ و بو
موجِ ہوا میں جنبشِ نبضِ جواں ہے آج

شکرِ خدا کہ طرّۂ طرفِ کلاہِ دوست
مشعل فروزِ مجلسِ روحانیاں ہے آج

پھر چہرۂ بشر پہ ہے رنگِ اُلوہیت
پھر فرشِ خاک پر سرِ کرّوبیاں ہے آج

اوجِ فلک پہ موجۂ ابرِ سُبک خرام
صحنِ چمن میں جلوۂ سروِ رواں ہے آج

وہ دُختِ رز کہ تھی خمِ رنگیں میں معتکف
صد شکر صدرِ انجمنِ مے کشاں ہے آج

اُف ری شمیم کاکلِ شب رنگ و بوئے عود
دوشِ صبا پہ دولتِ باغِ جناں ہے آج

رندوں کے ساتھ رُوحِ دو عالم ہے رقص میں
یومِ طوافِ کعبۂ رطلِ گراں ہے آج

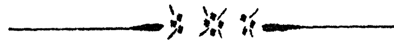
ہر آرزو کے فرق پہ کج ہے کلاہِ ناز
"عین الیقین" بہشت کا وہم و گماں ہے آج

زیرِ نگیں زمین ہے، قبضے میں آسماں
آفاق پر حکومتِ پیرِ مغاں ہے آج

ہر خشک و تر میں گونج رہی ہیں حکایتیں
ہر ذرّۂ حقیر کے منہ میں زباں ہے آج

رہ رہ کے اُڑ رہا ہے مسیح و خضر کا رنگ
کیا جانئے کس لباس میں عمرِ رواں ہے آج

اے جوشؔ زلزلے میں ہے قصرِ تعیّنات
دل ماورائے قیدِ زمان و مکاں ہے آج



چند جرعے

جرعۂ اوّل

تعالی اللہ شانِ بادہ خواری
نئی ہلچل، نرالی بیقراری

کوئی کروٹ سی دل میں لے رہا ہے
لہو میں کشتیاں سی کھے رہا ہے

یہ کس کی سن رہی ہے روح آہٹ
رگوں میں ہے مزے کی سنسناہٹ

چمکتی ہیں فضا میں بجلیاں سی
لچکتی ہے رگ و پے میں کماں سی

زہے رفتارِ خونِ زندگانی
بغیر اسبابِ شادی، شادمانی

نئی شکلیں ہیں سینے پر منقّش
مبارک امتزاجِ آب و آتش

پیے بیٹھا ہوں آج اے زاہدِ خام
شرابِ رندخوار و ساغر آشام

ادھر ہنگامۂ صہبا پرستی
ادھر آویزشِ تمکین و مستی

سخن کی داد خود سے پا رہا ہوں
کلی کی طرح کھلتا جا رہا ہوں

اٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

جرعۂ دوم

رگ و پے میں ہے غلطاں نغمِ جوانی
ہر اک لمحہ ہے عمرِ جاودانی

مری مٹھی میں ہے روحِ مہ و سال
تپاں ہے ماضی و مستقبل و حال

ترانے، وقت سے آزاد ہو کر
ہوے ہیں ساز کے پردوں سے باہر

گھٹا سی اک سنہری آ رہی ہے
پھریری پر پھریری آ رہی ہے

گراں زنجیرِ دانش گل رہی ہے
متانت کی جوانی ڈھل رہی ہے

ہواؤں میں ہیں شاہانہ ترانے
ابلتے ہیں گلابی سے خزانے

سبو کی آگ سے دہکے ہوئے ہیں
فضا میں پھول سے مہکے ہوئے ہیں

چمن بر دوش ہے کوئل کی کوکو
صراحی در بغل پھولوں کی خوشبو

کبھی ظلمت، کبھی انوارِ مہتاب
خدا معلوم، بیداری ہے یا خواب

یہ کیسی طرفگی ہے آج ساقی؟
صراحی میں ہے نورِ وجہِ باقی

اٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زہدِ ریائی

جُرعۂ سوم

تعالی اللہ شانِ مے پرستی | گھٹا سی ہے گرجتی اور برستی
ندی ساون کی چڑھتی آ رہی ہے | سُوئے میخانہ بڑھتی آ رہی ہے
اُٹھی ہیں جھُومتی کالی گھٹائیں | گھٹائیں، شوخ، متوالی گھٹائیں
اُبلتی ہے شرابِ ارغوانی | برستا ہے مزے لے لے کے پانی
سرِ میخانہ حُوریں آ رہی ہیں | نگاہیں، رام رَس ٹپکا رہی ہیں
ہر اک ذرّے میں جُنباں ہیں زبانیں | زمیں پر لوٹتی پھرتی ہیں تانیں
فنا کی بیڑیاں پھر گل رہی ہیں | بقا کی مشعلیں پھر جل رہی ہیں
ہر اک ذرّہ کِھلا جاتا ہے گویا | گلے آ کر، مِلا جاتا ہے گویا
بڑھا جاتا ہوں، دریا ہو کہ وادی | مُبارک دولتِ خود اعتمادی!
ہوائیں چل رہی ہیں سنسناتی | مہکتی، سرسراتی، گنگناتی
شریعت پر تباہی آ رہی ہے | مشیّت کو جماہی آ رہی ہے

اُٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زُہدِ ریائی

جُرعۂ چہارم

عجب شاہانہ کیفیت ہے طاری — ستاروں پر ہے میرا حکم جاری
زمیں اس وقت اک وہم و گماں ہے — مرے شہپر کے نیچے آسماں ہے
ابد کا نور رقصاں ہے جبیں پر — خلا ہے وقت کے سینے کے اندر
ہر اک لمحہ ترانے گا رہا ہے — زمانہ یوں کمر لچکا رہا ہے
برستے ہیں فسوں پرور ترانے — اُبلتے ہیں جوانی کے فسانے
مجازی صورتوں پر ہے بحالی — حقایق ہو چکے ہیں لااُبالی
بہکتے، رقص کرتے، لڑکھڑاتے — اُٹھے ہیں مغبچے دُھومیں مچاتے
چمکتی ہیں بتوں کی بالیاں سی — فضا پر بج رہی ہیں تالیاں سی
جوانی روح میں اٹھلا رہی ہے — نظر پر کاکلیں بکھرا رہی ہے
نہ دل کو امتیازِ این و آں ہے — نہ خود پر بندہ ہونے کا گماں ہے

اُٹھا ساغر، کہ پھر آواز آئی
کہ بدمستی بہ از زُہدِ ریائی

جرعۂ پنجم

تعالی اللہ شکستِ خود نمائی — بھرا ہے خاک میں زورِ خدائی

فلک پر نشہ سا چھایا ہوا ہے — زمیں کو حال سا آیا ہوا ہے

جوانی ہے زمیں سے آسماں تک — برابر آسماں سے لامکاں تک

چمن میں فصلِ گل اٹھلا رہی ہے — ہوا پر عمرِ رفتہ گا رہی ہے

ہتیلی پر لیے ہوں گلستاں کو — کہاں کا گلستاں، سارے جہاں کو

فلک، حیرت سے مُنہ کھولے ہوئے ہے — زمیں اُڑنے کو پر تولے ہوئے ہے

فرشتے ہر طرف منڈلا رہے ہیں — پیامی آ رہے ہیں، جا رہے ہیں

نظر میں صورتیں سی پھر رہی ہیں — نقابیں اُٹھ رہی ہیں، گر رہی ہیں

شریعت سے کنارا ہو چکا ہے — مشیت کا اشارا ہو چکا ہے

جبینِ "حال"، پر ہے نقشِ "ماضی" — کوئی حد بھی ہے اِن بدمستیوں کی

زمانے کے بعید و متصل مست — دماغِ عقل پرور مست، دل مست

بقا مست و حیاتِ جاوداں مست — فنا سرشار و مرگِ ناگہاں مست

ہوائے تاک و برگِ یاسمن مست — بُتِ نوخیز و صہبائے کہن مست

بلند و پست مست و جزو و کُل مست — عنادل مست، گل چیں مست، گُل مست

شگوفہ مست و گل مست و چمن مست | زباں مست و دہاں مست و سخن مست
تدبر مست، حکمت مست، دیں مست | عقائد مست ظن مست و یقیں مست
ملک مست و فلک مست و قضا مست | قمر مست و فضا مست و صبا مست
مغنّی مست، بربط مست، لے مست | سُبوکش مست، ساغر مست، مے مست
خذف مست و صدف مست و گہر مست | ثمر مست و حجر مست و شجر مست
جہاں مست و زماں مست و مکاں مست | عناصر مست، جوہر مست، جاں مست
رواجِ خیر مست و رسمِ شر مست | سفالیں کوزہ مست و کوزہ گر مست

یہ ہے بدمستیوں کا زور، ساقی! | محیطِ غیب میں ہے شور، ساقی!
مجھے ارض و سما سے کد نہیں ہے | وگرنہ مستیوں کی حد نہیں ہے
اگر چاہوں تو دُنیا کو ہلا دوں | زمیں کیا، آسمانوں کو نچا دوں

فلک کیا، عرش کو بھی پست کر دوں
خودی کیسی، خدا کو مست کر دوں!

شبِ نشاط

کیا میکدے کی رات نشاط آفریں ہے آج
گلرنگ موجِ بادہ سے اُن کی جبیں ہے آج[1]

ہر لغزشِ قدم سے ٹپکتے ہیں زمزمے
ہر جنبشِ نگاہ سرود آفریں ہے آج

شوخی سے ہمکنار ہے چشمِ حیا پرست
تمکیں سے بے خبر نگہِ شرمگیں ہے آج

ہر شے پر آسماں سے برستی ہیں رونقیں
ہر ذرّہ کائنات کا اک نازنیں ہے آج

جس جامِ زر کو چُومئے، لعلِ شکر فروش
جس مُغبچے کو دیکھئے، زہرا جبیں ہے آج

چھپ چھپ کے پینے والوں کو ملتا نہیں ہے بار
مر مر کے جینے والوں کی پُرسش نہیں ہے آج

پھیلی ہوئی ہے عرش سے تا فرش چاندنی
نیلم ہے آسمان، زمُرّد زمیں ہے آج

قند و شکر میں غرق ہیں کام و دہن تمام
خُم میں شرابِ تلخ نہیں، انگبیں ہے آج

ساقی کی لے میں بربطِ داؤد کا ہے سوز
صہبا کی بُو میں نکہتِ خلدِ بریں ہے آج

ساغر سے رنگِ عارضِ سلمیٰ ہے آشکار
مینا میں حُسنِ لیلیِ محمل نشیں ہے آج

ساقی پہ اِس بلا کی پھبن ہے کہ الاماں
قربان اک نگاہ پہ دُنیا و دیں ہے آج

---

[1] میں نے اسی طرح دیکھا تھا۔ (جوشؔ)

چھائی ہوئی ہے ارض و سما پر وہ بیخودی تو یہ کہے کہ ہوش میں دُنیا نہیں ہے آج

کیوں موجِ بادہ ہو نہ ثُریّا سے بھی بلند

پائے سُبو پہ جوشِ سخن آفریں ہے آج



آج کی رات

(سنہ ۱۹۳۴ء)

دیدنی ہے مری محفل کا سماں آج کی رات
موجِ صہبا میں ہے رقصِ دو جہاں آج کی رات

تُل گیا ہے کوئی اس طرح گُل افشانی پر
ذرّے ذرّے پہ ہے جنّت کا گماں آج کی رات

قابلِ دید ہے بکھرے ہوئے پھولوں کی بہار
ہر شکنِ فرش کی ہے کاہکشاں آج کی رات

ایک موہوم سا نقطہ ہے جہاں ارض و سما
ایسا اک دائرہ ہے رطلِ گراں آج کی رات

اثرِ مے سے ہے پگھلا ہوا سونا گویا
عرق آلودہ رُخِ سیمبراں آج کی رات

پرتوِ بادۂ روشن سے ہے بے گرد و غبار
اُفقِ عربدۂ زہرہ وشاں آج کی رات

قابلِ ظلم نہیں فطرتِ خوباں اِس وقت
قادرِ جور نہیں طبعِ بتاں آج کی رات

شمع ہے قابلِ پروانۂ آشفتہ مزاج
حسن ہے مائلِ صاحب نظراں آج کی رات

آبِ حیواں کا نہ کر ذکر کہ حاصل ہے مجھے
دولتِ قربِ مسیحا نفساں آج کی رات

جوئے کہسار کے مانند گزر عالم سے
یہ ہے فرمانِ جہانِ گزراں آج کی رات

اُف ری ساحل پہ غزالہائے رواں کی ہلچل
اک تلاطم ہے سرِ آبِ رواں آج کی رات

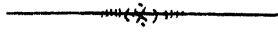
غلغلہ ساز کا ہے، دیرِ مغاں سے لے کر
تا بہ خلوت گہِ حورانِ جناں آج کی رات

جیسے بھیگی ہوئی زُلفوں کی مہک عُود آمیز　　نفسِ شام ہے یوں مشک فشاں آج کی رات

خادمانِ درِ ساقی کے سروں پر کج ہے　　کُلہِ خواجگیِ کون و مکاں آج کی رات

حلقہ باندھے ہوئے میخوار ہیں سرگرم طواف

جوشؔ ہے قبلۂ رندانِ جہاں آج کی رات



کل رات کو

(سنہ ۱۹۳۴ء)

دِیدنی تھا میری محفل کا سماں کل رات کو
مہربان تھا وہ بُتِ نامہرباں کل رات کو

"ناز"، تھا طغراکشِ دیوانِ آدابِ نیاز
"تیغ" تھی پیغمبرِ امن و اماں کل رات کو

چھو رہی تھی دل کو موجِ رنگ تیروں کے عوض
کھنچ رہی تھی ابروؤں کی یوں کماں کل رات کو

لوٹتی تھی کس تکلّف سے ہوا کے دوش پر
چاندنی میں کاکُلِ عنبرفشاں کل رات کو

اللہ اللہ فرشِ مے نوشی کی اوج اندیشیاں
فرشِ پا انداز تھا کونؒ و مکاں کل رات کو

الاماں ٹھنڈی ہوا کے گدگدانے کی ادا
ہر کلی کو آ رہی تھیں ہچکیاں کل رات کو

مسندِ زرّیں پہ "بسرِ دلبراں" کے زمزمے
تھے بہ انداز "حدیثِ دیگراں" کل رات کو

کاکلیں لہرا رہی تھیں روئے عالم تاب پر
سنبلستاں کا تھا گُل پر سائباں کل رات کو

پھول تھے غرقِ عرق، پانی ہوئے جاتے تھے جام
سُرخ تھیں اُس شوخ کی یوں انکھڑیاں کل رات کو

آ رہی تھی جنبشِ مژگانِ عالم کی صدا
یوں لبِ گُل رنگ تھا افسانہ خواں کل رات کو

کیا تلاطم تھا کہ میری کشتیٔ اُمید میں
کاکلِ شبرنگ کا تھا بادباں کل رات کو

غیب کے پردے سے آوازیں مبارک باد کی
آ رہی تھیں کارواں در کارواں کل رات کو

سامنے تھی جلوہ گاہِ کرسیٔ و لوح و قلم
اک دریچہ بن گیا تھا آسماں کل رات کو

ہر سخن میں گونجتی تھی اسمِ اعظم کی صدا
ہر نفَس تھا اک حیاتِ جاوداں کل رات کو

وقت کے ہاتوں پہ روشن تھیں ابد کی مشعلیں
ایسی اک منزل میں تھی عمرِ رواں کل رات کو
وہ ترنّم تھا کہ علم و عقل کے ہوتے ہوئے
زیست کی سی شے تھی اک جنبشِ گراں کل رات کو
چاندنی، دریا، شگوفے، راگنی، بربط، شراب
پھٹ پڑی تھیں بزم پر رنگینیاں کل رات کو
نرگسِ مخمور و آب آتشیں و موجِ گُل
ہر طرف تھیں سُرخیاں ہی سُرخیاں کل رات کو
گردنِ مینا جھکاتے ہی اُبل پڑتے تھے جام
گنگنا اُٹھتا تھا یوں پیرِ مغاں کل رات کو
وجد میں تھی جھلملاتی مشعلوں کی روشنی
رقص میں تھا پرتوِ رطلِ گراں کل رات کو
ناز کرتی جس طرح گردوں پہ جاتی ہے دُعا
اُٹھ رہا تھا مشعلوں سے یوں دھواں کل رات کو
محفلِ زہرا میں تھا ہنگامۂ رقص و سرود
آسماں پر بج رہی تھیں چوڑیاں کل رات کو

میں بھی لافانی ہوں مثلِ وجہِ ربِّ ذوالجلال
دل کو ہوتا تھا یہ رہ رہ کر گماں کل رات کو

جوشؔ کے پہلو میں تھیں ارض و سما کی نعمتیں
حیف! اک تو ہی نہ تھا اے رازداں کل رات کو



رقاصۂ میکدہ

کل رات کو ساقی نے عجب دُھوم مچادی — آنکھوں میں جو کھنچتی ہے وہ صہبا بھی پلادی

مَے نازکی، نزدیک سے چھلکا کے دمِ رقص — بُو دور سے مہکی ہوئی زُلفوں کی سُنگھادی

آنے لگیں ہونٹوں پہ تبسّم کی جو لہریں — رَو کوثر و تسنیم کی آنکھوں میں دکھادی

سر کیف میں تھوڑا سا جھکا، اور اُٹھی آنکھ — گویا درِ مے خانہ کی زنجیر ہلادی

سینے پہ پڑا سر کے جھکانے سے جو سایہ — اُس سایۂ شبگوں نے مری رُوح جگادی

سرشار جوانی کی وہ بدمست لگاوٹ — لب نے چھپالی تو نگاہوں نے بتادی

مستانہ غزل چھیڑ کے بیلا جو اُٹھایا — "قربان تری آواز کے" زہرا نے صدا دی

نظروں کو کیا شوخیٔ مے نے کبھی آزاد — پلکوں کو حیا نے کبھی زنجیر پنہادی

آشفتہ مزاجوں کو کبھی ناز سے دیکھا — گستاخ نگاہوں کو کبھی آنکھ دکھادی

دُنیا کا کوئی ساز جسے پا نہیں سکتا — ہونٹوں پہ زباں پھیر کے وہ دُھن بھی سُنادی

انگڑائی جو آئی تو کچھ اس ناز سے دیکھا — آنکھوں نے کیا شُکر، تمنّا نے دُعا دی

المختصر آنکھوں میں مری ڈال کے آنکھیں معلوم نہیں آگ لگا دی کہ بجھا دی

کیا بات ہے اے جوشؔ! ترے مست قلم کی
تُو نے تو شبِ قدر نگاہوں سے گرا دی



جشنِ نو

پھر طرزِ نو سے زینتِ صحنِ چمن ہے آج
گلشن میں کج کلاہِ گل و یاسمن ہے آج

پھر جامِ زر میں جمع ہے صہبا و نورِ ماہ
پھر اتصالِ جلوۂ گنگ و جمن ہے آج

پھر اہلِ دل کی عقدہ کشائی کے شوق میں
سرگرمِ نازِ زلفِ شکن در شکن ہے آج

تمہیدِ شرحِ صدر ہے پھر شغلِ مے کشی
پھر برقِ طور، موجِ شرابِ کہن ہے آج

پھر عکسِ زلفِ یار ہے قلبِ فگار پر
پھر ابرِ تیرہ صدر نشینِ چمن ہے آج

پھر بوستاں میں طرۂ طرفِ کلاہِ دوست
وجہِ فروغِ افسرِ سرو و سمن ہے آج

پھر خدمتِ نیاز پہ مائل ہے روحِ ناز
پھر زانوئے صنم پہ سرِ برہمن ہے آج

لرزاں تھی جس کے وعدۂ فردا سے زندگی
پہلو میں پھر وہ شاہدِ پیماں شکن ہے آج

زخمِ نگاہِ بد سے بچائے رہے خدا
دیکھو تو کوئی جوش پہ کیا بانکپن ہے آج

ایک تمنّا

عیدِ گُل ہو، اور ہجومِ ساقیانِ سیم ساق
ایسی اک گردش بھی ہاں اے گنبدِ فیروزہ طاق

یوں بساطِ عیش پر ہو چنگ و بربط کا خروش
لحن میں تبدیل ہو جائے فغانِ اشتیاق

اپنے اپنے طرز میں ہو ہر شریکِ بادہ فرد
اپنے اپنے رنگ میں ہو ہر حریفِ کیف طاق

راگ کے شعلوں سے دُنیا کو بنا دیں یوں رقیق
زاہدوں کے آہنیں سینوں میں گل جائے نفاق

جراتِ رندانہ و جوشِ جنوں ہو صدرِ بزم
رکھ دیا جائے خرد کا آئینہ بالائے طاق

جھوم کر چھا جائیں مستی کی گھٹائیں روح پر
کیسی دُنیا بلکہ خود عقبیٰ کو بھی دے دیں طلاق

گائیں، ناچیں، لڑکھڑائیں، گنگنائیں، تال دیں
دلبرانِ شوخ و شیریں، مہ وشانِ چُست و چاق

کاکلِ برہم سے مہکے سینۂ موجِ صبا
قُلقُلِ مینا سے گونجے گنبدِ نیلی رواق

خرمنِ حکمت جلا دے مطربوں کی برق نے
صولتِ عصمت مٹا دے میکشوں کا طمطراق

جیسے ہلکی نیند میں پانی برسنے کی صدا
یاد آئے وصل میں یوں گریۂ شامِ فراق

ایک شب کے واسطے جنّت بنا لوں دہر کو
مہرباں ہو جائے کاش اے جوشؔ بختِ اتّفاق

دعوتِ ناؤنوش

اُٹھ کہ اے ساقی بدل دیں راہ و رسمِ کفر و دیں
یہ گھٹائیں، اور پھر تقویٰ! نہیں، ہرگز نہیں

آ، کہ پھر لرزاں ہے کوئل کی صدا سے آسماں
اُٹھ، کہ پھر رقصاں ہے ابر و باد سے صحنِ زمیں

آ، کہ پھر دریا میں مچلے پرتوِ روئے صبیح
اُٹھ، کہ پھر ساغر میں کھیلے عکسِ زلفِ عنبریں

کُوکتا ہے پھر پپیہا، جھومتی ہے پھر گھٹا
توڑ دے مُہرِ خموشی، کھول دے چینِ جبیں

محوِ عشرت ہو بہ فرمانِ شبابِ عشوہ کار
گرمِ جلوت ہو بہ رغمِ زاہدِ خلوت نشیں

آ پلا اپنے گدا کو آج ساقی! یوں شراب
آسماں ہو جائے قابو میں، زمیں زیرِ نگیں

اُس جنوں سے کر مجھے سرشار جس کے روبرو
لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے عقلِ اوّلیں

مُطربِ رنگیں! بتا دے راہِ صوتِ سرمدی
قلقلِ مینا! سُنا دے نغمۂ روح الامیں

توبہ توبہ فصلِ گُل میں، اور میں توبہ کروں!
میں کوئی کافر نہیں، الحمدُ ربّ العالمیں

اِس بھری برسات میں طوفان بن کر مے پلا
کھول دے پُرپیچ و خم زلفیں، اُلٹ لے آستیں

تُند جھونکے، تیز بارش، مست بادل، سُرخ جام
آج اے ساقی! زمانہ ہوش میں گویا نہیں

فرصتِ عشرت غنیمت ہے، خدارا ہوشیار
زندگی ہے تیغ بر دست و کفن در آستیں

ناز کر اے یار! اپنی دلبری پر ناز کر
جوشؔ سا مغرور ہے تیرا غلامِ کمتریں!

پیامِ کیف

علی الصّباح کہ موجِ صبا تھی عنبر بیز — سمندِ فکر کو رقصِ نسیم تھا مہمیز

کھلا رہی تھی شگوفے صبا کی گرمیِ ناز — تپا رہی تھی گلوں کو نمو کی آتشِ تیز

سماں تھا وادی و کہسار کا نشاط افروز — ادا تھی سرو و گل و یاسمن کی ولولہ خیز

دل و دماغ پہ چھایا ہوا تھا کیفِ سحر — کہ لائی موجِ صبا یہ پیامِ کیف آمیز

"تجھے خبر بھی ہے، اے نو اسیرِ کاکلِ دہر! — کہ ہر نفس ہے یہاں اک طلسمِ حیرت خیز

نظر کی ہے غلطی تختِ قیصر و جمشید — سراب کی ہے چمک تاجِ نادر و پرویز

زمینِ حرص پہ رکھیو ذرا سنبھل کے قدم — کہ اس زمیں پہ ہے خوابیدہ فتنۂ چنگیز

مذاقِ زہد بھی ناقص، کہ شیخ کی ہے بساط — رکوعِ کید سرشت و سجودِ مکر آمیز

شرابِ ناب طلب کر کہ تجھ پہ کھل جائے — کہ آسماں گہر افشاں، زمیں ہے نکہت بیز

انڈیل ساغرِ زرّیں میں آتشِ سیّال — جو چاہتا ہے کہ ہو نبضِ شادمانی تیز

وہ انجمن ہے حریفانِ بادہ پیما کی — جہاں دوا سے ہے نفرت، دعا سے ہے پرہیز

وہ سرزمینِ ابد ہے دیارِ مے نوشی — جہاں ہے وقت سے ہر ایک لمحہ گرمِ ستیز

وہ آستاں ہے شبستانِ بادہ خواری کا　　　جہاں سُجود میں ہے بیمِ صبحِ رستاخیز
کسے نصیب یہ دو نعمتیں زمانے میں　　　شرابِ کُہنہ و گُلْ بانگِ ساقیِ نوخیز

فدائے دامنِ صد چاک مے گُساراں باد
"ہزار جامۂ تقویٰ و خرقۂ پرہیز"

(حافظ)



جواب اس شب کا دُنیا میں نہیں ہے

(سنہ ۱۹۳۲ء)

جواب اِس شب کا دنیا میں نہیں ہے
مرے پہلو میں پھر وہ نازنیں ہے

فضا پر کھیلتی ہے نوجوانی
ہوا میں مستئ وجد آفریں ہے

سُبک فانوس میں طرّار شعلہ
بہ رنگِ یوسفِ زنداں گزیں ہے

گلابی میں شرابِ ارغوانی
بہ نازِ لیلئ محمل نشیں ہے

معاذ اللہ یہ رنگیں فضائیں
نہیں، دُنیا نہیں، خلدِ بریں ہے

جنوں انگیز کاکل کی درازی
شکست زُہد کوتہ آستیں ہے

قریب شام جیسے غنچۂ گل
گلابی یُوں وہ چشمِ سُرمگیں ہے

وفورِ کیف میں احساسِ مستی
گماں سا ہے، گماں میں کچھ یقیں ہے

دمک اُس رُخ پہ کچھ ایسی ہے، گویا
زمانے کی صباحِ اوّلیں ہے

تجلّی ظلمات میں ہے آبِ حیواں
سیہ کاکل کے سائے میں جبیں ہے

مری نظروں کے آگے سرخوشی میں
حجابِ زندگی باقی نہیں ہے

عیاں ہے جوہرِ بالائے گردوں
نُمایاں دولتِ زیرِ زمیں ہے

[illegible] واسطے خا[illegible] ، ر ہا [illegible] تب اک جہاں ہے اور جنیں ہے

وہاں قہرِ خدا کا ذکر، کیا خوب! — جہاں قہرِ خدا مہر آفریں ہے
وہاں ارض و سما کی شرح و تفسیر! — جہاں ارض و سما زیرِ نگیں ہے
وہاں، اور موت کی تشریحِ پُرہول! — جہاں موت اک کنیزِ کمتریں ہے
یہاں وہ موت ہے اِک وہمِ باطل — تجھے جس موت کا حق الیقیں ہے
خدا، تیرے تخیّل میں ہے "قہّار" — بشر، یاں "رحمۃ اللعالمیں" ہے
یہاں "قہّار" بن جاتا ہے "رحمٰن" — کہ یہ رندی ہے، درویشی نہیں ہے
یہاں ہر بُوند میں ہے موجِ کوثر — یہاں ہر فرش پر عرشِ بریں ہے
یہاں ہر سانس ہے اک سیلِ الہام — یہاں ہر نقش، اک نقشِ نگیں ہے
یہاں کی شورشوں میں ہے ترنّم — یہاں کی تلخیوں میں انگبیں ہے
یہاں ہر قہقہہ ہے لحنِ داؤد — یہاں ہر زمزمہ رُوح الامیں ہے
یہاں ہر سنگ ہے لعلِ بدخشاں — یہاں ہر خار برگِ یاسمیں ہے
یہاں کونین ہے اک موجِ صہبا — یہاں ارض و سما اک ساتگیں ہے
یہاں ہر جام میں غلطاں ہے کوثر — یہاں ہر جیب میں خلدِ بریں ہے
یہاں ہر مُطربِ حسن و جوانی — یکے از انبیائے مُرسلیں ہے

یہاں ہر غلغلہ ہے خالقِ جاں — یہاں ہر ولولہ دہر آفریں ہے
تری دُنیا ہے زشت و خوب میں گم — مری سرحد ورائے کُفر و دیں ہے
مجھے ہر کلیہ ہے ظن و تخمیں — تجھے ہر واہمہ حق الیقیں ہے
ترا سر ہے شریعت کے قدم پر — یہاں پائے مشیت پر جبیں ہے
مرا پیمانہ ہے یزداں در آغوش — ترا احرام بُت در آستیں ہے
ز روئے نصِ قرآں نفعِ مَے سے — تجھے انکار کی جُرأت نہیں ہے
اُرے او عظمتِ عصیاں کے منکر! — "گناہوں" پر مرے کیوں خشمگیں ہے؟

خلافت ارض کی بخشی ہے جس نے
وہ آدمؑ کا گناہِ اوّلیں ہے

ذرا تو دیکھ اِس حسنِ جواں کو — تری آنکھوں میں بینائی نہیں ہے؟
نظر میں ہے فروغِ لالہ و گُل — کمر پر موجِ زُلفِ عنبریں ہے
تجمُّل میں ہے اک شانِ تبسُّم — تبسُّم ہے کہ موجِ انگبیں ہے
تکلُّم میں ہے تمکینِ خموشی — خموشی ہے کہ لحنِ دلنشیں ہے
تخاطب میں ہے اندازِ تغافُل — تغافُل ہے کہ چشمِ دُوربیں ہے
معاذ اللہ یہ اَلھڑ بادہ نوشی — کہیں چادر ہے، اور آنچل کہیں ہے

لہکتی، گنگناتی، لڑکھڑاتی جوانی ہوش میں گویا نہیں ہے
صدا یہ دے رہا ہے طور سے کون؟
کوئی کہہ دو مجھے فرصت نہیں ہے!

صُبحِ میکدہ

(سنہ ۱۹۲۶ء)

میخانے کو صُبح جا کے دیکھا — عالم تھا سکُوتِ خواب کا سا
ہلکی سی وہ روشنی گلاُبی — کہتی تھی کہاں گئے شرابی
تھیں فرش پہ سِمٹیں سی ہر سُو — زانو سے ملے تھے شب کو زانو
پیدا تھا سکوت سے ترانہ — تھی فرش کی ہر شکن فسانہ
شیشوں سے جو مے چھلک گئی تھی — رودادِ نشاط کہہ رہی تھی
کچھ نقشِ قدم جہاں بنے تھے — سجدوں کے وہیں نشان بنے تھے
حجروں کی ہوا بسی ہوئی تھی — خوشبو سے نئی جوانیوں کی
آتی تھی خموشیوں سے ہر بار — رقاصہ کے گھنگرُوؤں کی جھنکار
شیشوں کے خطوط میں بصدِ ناز — غلطیدہ تھی ہاؤ ہُو کی آواز
گنُبد میں تھی محوِ پر فشانی — اربابِ نظر کی شعر خوانی
پردوں میں مچلتی تھیں زبانیں — پھُولوں میں بھری تھی داستانیں

لہریں سی ہوا میں لے رہے تھے
ملبوس حریر و پرنیاں کے

بالائے ہوا بنے ہوئے تھے
دُزدیدہ نگاہیوں کے جادے

غنچے سے فضا میں کھل رہے تھے
نظروں کے خطوط مِل رہے تھے

آئینوں میں کچھ عیاں تھا، کچھ گم
اک زہرہ جمال کا تبسّم

وہ حجلۂ کیف، جس میں شب بھر
تھا مطربِ مے سے ایک محشر

ہنستا ہی تھا، اور نہ رو رہا تھا
جاگا ہوا شب کا سو رہا تھا

نغمے، کہ چھڑے رہے تھے شب بھر
آسودہ تھے بام و در کے اندر

حجرے میں تھی رات یوں سمائی
جاذب میں ہو جیسے روشنائی

یوں جذب کئے ہوئے تھے ذرّات
انفاس و تبسّم و خیالات

ذرّوں کو کوئی فشار اگر دے
پھر منعقد ایک بزم کر دے



ہُو

نہ میکشوں کا وہ گلشن رہا، نہ لالہ رہا
نہ زاہدوں کا وہ زُہدِ ہزار سالہ رہا

نہ کوئی دفترِ آداب کا رہا نسخہ
نہ کوئی مصحفِ انداز کا رسالہ رہا

نہ سوز و ساز کا قائم رہا مقولہ کوئی
نہ علم و عقل کا باقی کوئی مقالہ رہا

نہ اہلِ عیش کے وہ دلفریب لحن رہے
نہ اہلِ درد کا وہ جانگداز نالہ رہا

حریمِ کیف میں تاریخِ رفتگاں بنکر
رہا تو حضرتِ ساقی کا اک پیالہ رہا

تأثرات

پروگرام

(سنہ ۱۹۳۳ء)

اے شخص! اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملیگا

اور صبح کو وہ ناظرِ نظّارہ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملیگا

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی
شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملیگا

اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خرابات
رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملیگا

اور رات کو وہ خلوتیٔ کاکل و رخسار
بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملیگا

اور ہوگا کوئی جبر، تو وہ بندۂ مجبور
مُردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملیگا

"وقتِ مروّت"

(سنہ ۱۹۲۹ء)

علی الصباح کہ تھی کائنات سر بہ سجود
فلک پہ شورِ اذاں تھا، زمیں پہ بانگِ درود

بہارِ شبنم آسودہ تھی کہ رُوحِ خلیل
فروغِ لالہ و گُل تھا کہ آتشِ نمرود

جلا رہی تھی ہوا، بزمِ جاں میں شمعِ طرب
مٹا رہی تھی صبا، لوحِ دل سے نقشِ جمود

گلوں کے رنگ میں تھی شانِ خندۂ یوسف
کلی کے ساز میں تھا لُطفِ نغمۂ داؤد

ہر اک جبیں پہ درخشاں تھا نیّرِ اقبال
ہر ایک فرق پہ تاباں تھا طالعِ مسعود

فضائے چرخ میں دوڑی ہوئی تھی رُوحِ ظہور
بساطِ خاک پہ چھایا ہوا تھا رنگِ نمود

دماغ سے جو ملاتی ہے دل کی سرحد کو
وہ راہ عقلِ سُبک سَر جنوں سے تھی مسدود

حسین خواب سے چونکے تھے سمسائے ہوئے
مچل رہی تھی ہواؤں میں بُوئے عنبر و عود

یہ رنگ دیکھ کے آیا مجھے خیالِ نماز
مری نماز، کہ ہے شاہد و شراب و سرود

مری نماز، کہ ہے مہ وشوں سے راز و نیاز
مری نماز، کہ ہے مغبچوں سے گُفت و شنود

مری نماز، کہ ہے نغمہ ہو الباقی
مری نماز، کہ ہے نعرہ ہو الموجود

مری نماز، کہ ہے عشق ناظر و منظور — مری نماز، کہ ہے حُبّ شاہد و مشہود

مری نماز، کہ ہے ایک سازِ لافانی — مری نماز، کہ ہے ایک سوزِ لامحدود

مری نماز، کہ ہے دیدِ روئے ناشستہ — مری نماز، کہ ہے طوفِ حُسنِ خواب آلود

مری نماز "نظر"، شیخ کی نماز "الفاظ" — یہاں چراغ، وہاں صرف شمعِ کشتہ کا دُود

یہاں ہے رشتۂ انفاس میں ترنّمِ دوست — وہاں ہے دانۂ تسبیح پر مدارِ درود

وہاں کشاکشِ اغراض سے غمِ کم و کیف — یہاں لطافتِ احساس سے زیاں ہے نہ سُود

فغاں، کہ "جنبشِ اعضا" وہاں اساسِ نماز — خوشا، کہ لرزشِ دل ہے یہاں قیام و قعود

کسی مقام پہ حاصل نہیں قرار مجھے — سحر کو ہوں جو برہمن، تو شام کو محمود

غرضکہ آتے ہی وقتِ سحر خیالِ نماز — جبیں تھی پائے صنم پر، زباں پہ "یا معبود"!

تمام رازِ نہاں کھل گئے مرے دل پر — ز تکیہ گاہِ عدم، تا بہ کارگاہِ وجود

سرِ نیاز سے ظاہر ہوا تبسّمِ ناز — بطونِ خاک سے پیدا ہوا دُرِ مقصود

اُٹھا کے پھر سرِ پُرشوق پائے جاناں سے — کہا یہ میں نے کہ اے سروِ بوستانِ وجود

"بیا، بیا، کہ ترا تنگ در کنار کشیم — ز بوسہ مہر کنم بر لبِ شکر آلود"

مرے لبوں کو بھی دے رخصتِ ترانۂ حمد — ہر ایک ذرّہ ہے اس وقت آشنائے دُرود

یہ سن کے، شرم سے کوئی جواب بن نہ پڑا — جھکی نگاہ، جبیں ہو گئی عرق آلود

حیا نے بڑھ کے پکارا "یہ کاہشیں بیکار" نظر نے جھک کے صدا دی "یہ کاوشیں بے سود"

"دہانِ یار، کہ درمانِ دردِ حافظ داشت
فغاں، کہ وقتِ مروّت چہ تنگ حوصلہ بود"

نوجوانی کے مزے

(سنہ ۱۹۳۰ء)

یاد ہیں اب تک وہ عہدِ نوجوانی کے مزے — نوجوانی کے مزے کیا؟ زندگانی کے مزے

وصل کی بادِ خنک میں، ہجر کے طوفان میں — کامرانی کے مزے، ناکامرانی کے مزے

بسترِ حرماں پہ خونی کروٹوں کے ساتھ ساتھ — غم کی راتوں میں بلائے آسمانی کے مزے

بادلوں سے جھوم کر، سرشارِ ساغر چوم کر — جلوہ گاہِ رنگ و بو میں شعر خوانی کے مزے

موجِ بربط، موجِ گل، موجِ صبا کے سامنے — جامِ زرّیں و شرابِ ارغوانی کے مزے

صبح کی چاندی میں، شاخوں کے مچلنے کا سرور — شام کے سونے میں لہروں کی روانی کے مزے

روز اک اندازِ نو سے باہزاراں طمطراق — حلقۂ احباب میں جادو بیانی کے مزے

مست راتوں میں بہ فیضِ ارتباطِ حسن و عشق — میہمانی کے مزوں میں میزبانی کے مزے

بارہا آ آ کے زیرِ سایۂ شمشیرِ یاس — شعلہ پرور ولولوں کی سخت جانی کے مزے

روٹھنے اور روٹھ کر ملنے کے دورِ ناز میں — مہربانی کے مزے، نامہربانی کے مزے

صحبتِ ہمراز میں مکتوبِ رنگیں کی بہار — گوشۂ خلوت میں پیغامِ زبانی کے مزے

کمسنی کی خوابگاہوں میں، پئے تکمیلِ شوق
جرعہ جرعہ پی کے مے، افسانہ خوانی کے مزے

بارگاہِ دلبری میں گاہ فرطِ رعب سے
نقش بر دیوار ہو کر بے زبانی کے مزے

گاہ حرف و صوت کی سُبکی سے بچنے کے لئے
جنبشِ مژگاں میں دل کی ترجمانی کے مزے

پھول سے سر رکھ کے اکثر زانوئے پُر شوق پر
گلرخوں کی نیند کی ماتی جوانی کے مزے

جلوۂ صہبا کی رنگینی بھری برسات میں
آگ کی موجِ رواں کے ساتھ پانی کے مزے

خاکِ راہِ دوست میں اکسیر کی سی شوخیاں
نقشِ پائے یار میں تاجِ کیانی کے مزے

پہلوئے جاناں کی شیریں گرمیوں سے گاہ گاہ
عمرِ فانی میں حیاتِ جاودانی کے مزے

لرزشِ صہبا میں لہجے کا ترنم تول کر
پیشِ خوباں نطق کی گوہر فشانی کے مزے

بدگمانی کے محل پر حسنِ ظن کے ولولے
حسنِ ظن کے ولولوں میں بدگمانی کے مزے

التفاتِ یار کے دورِ طرب آہنگ میں
ہر قدم پر جوششِ مرگِ ناگہانی کے مزے

جوانی

(سنہ ۱۹۲۷ء)

کیا شرح کروں جوش، جب آتی ہے جوانی — سینے میں عجب دھوم مچاتی ہے جوانی
اک آگ سی پہلو میں لگاتی ہے جوانی — اُس آگ میں پھر دل کو تپاتی ہے جوانی
یوں خاک کو اکسیر بناتی ہے جوانی

اللہ رے جذب و کشش نرگسِ زیبا — احساس میں آتا ہے وہ طوفان کہ توبہ
پہلو میں کچھ اس طرح مچلتی ہے تمنّا — آغوش میں بے جائے ہوئے بن نہیں پڑتا
اس طرح اشاروں سے بُلاتی ہے جوانی

ہر روز قیامت کے نظر آتے ہیں ساماں — ہر صبح سُناتی ہے حدیثِ رُخِ تاباں
ہر شام دکھاتی ہے خمِ کاکُلِ پیچاں — ہر رات کو، وا کرکے درِ خانۂ خُوباں
پہلو میں حسینوں کے بٹھاتی ہے جوانی

ہر آنکھ میں پلکیں ہیں سنبھالے ہوئے بھالے — اک کھیل ہے، جو سامنے آئے، وہ لُبھالے
ہر راہ میں معشوق ہیں، گورے ہوں، کہ کالے — ہر گام پہ موجود ہیں دل چھیننے والے
ہر بام پہ سو طور دکھاتی ہے جوانی

ہر شے پہ عجب حسن ہے، کیا دل کو بچائیں ہر ذرۂ عالم پہ برستی ہیں ادائیں
ہر سنگ سے اصنام کی آتی ہیں صدائیں الفاظ ہی ملتے نہیں کیا تجھ بتائیں
ہر چیز کو کیا کر کے دکھاتی ہے جوانی

اللہ رے خم کاکل و رنگ لب و رخسار جو سامنے آیا، وہ ہوا دل سے خریدار
زنجیر میں گیسو کی دو عالم ہے گرفتار صوفی ہو کہ مے نوش، گدا گر ہو کہ زردار
دیکھو جسے، کھینچے لیے جاتی ہے جوانی

اوروں کا کوئی ناز لبھاتا ہی نہیں ہے جز اپنے، کوئی دل میں سماتا ہی نہیں ہے
جلوہ ہو کوئی، رنگ جماتا ہی نہیں ہے اپنا کوئی ثانی نظر آتا ہی نہیں ہے
اس ناز سے آئینہ دکھاتی ہے جوانی

خوں ریزو دل آرام ہے کمبخت کی چتون ظالم کی ہر اک آن ہے تمکین کی دشمن
ممکن نہیں جلنے سے بچالے کوئی دامن ہم کیا ہیں، رسولوں کے سلگ اٹھتے ہیں خرمن
بجلی وہ تبسم سے گراتی ہے جوانی

اللہ ری خواب آوری لحن خدا ساز تاروں کا دریچہ کوئی رہتا ہی نہیں باز
یکسوئی وہ ہوتی ہے کہ آتی ہے بصد ناز مژگان دو عالم کے جھپک جانے کی آواز
جب پچھلے پہر ساز اٹھاتی ہے جوانی

اللہ ری خوبانِ مجازی کی حکومت — معشوقِ حقیقی کو بھی ہو جاتی ہے حیرت
منھ ڈھانپنے لگتا ہے بہ افراطِ ندامت — پیرانِ کہن سال کا پندارِ عبادت
اصنام کے یوں ناز اُٹھاتی ہے جوانی

ذرّوں میں دمکتے ہیں دُرِ صاعقہ پرور — قطروں سے اُبلتے ہیں شرابوں کے سمندر
خاشاک کے سینے میں جھلکتے ہیں گُلِ تر — آئینوں کے اندر نظر آتا ہے سکندر
ہر بُت کو خدا کر کے دکھاتی ہے جوانی

ہر خار میں اک پھول ہے، ہر پھول میں لچکا — ہر رگ میں اک رنگ ہے، ہر رنگ میں گلزار
ہر موج میں اک رقص ہے، ہر رقص میں جھٹکا — ہر شاخ میں اک لوچ ہے، ہر لوچ میں تلوار
تصویر پہ تصویر بناتی ہے جوانی

کیا کفر کی قوّت ہے کہ دب جاتا ہے ایماں — اسلام کے سینے میں لرز اُٹھتا ہے قرآں
اُڑ جاتے ہیں مسجد میں مؤذّن کے بھی اوسان — گھبرا کے نکل آتے ہیں کعبے کے نگہبان
یوں دَیر کی زنجیر ہلاتی ہے جوانی

جوانی کی رات

(سنہ ۱۹۲۳ء)

شب، کہ حریمِ ناز میں شورِ صد اضطراب تھا
عشق بھی تھا برہنہ سر، حسن بھی بے نقاب تھا

آنکھوں میں سُرئے یار تھا، آنکھیں تھیں روئے یار پر
ذرّہ تھا آفتاب میں، ذرّے میں آفتاب تھا

خشکیِ تکلفات کی ٹوٹ چکی تھیں سب حدیں
چشمکِ بے دریغ تھی، خندۂ بے حجاب تھا

حسن کی بزمِ عشوہ میں شمعِ وفا تھی ضَو فگن
عشق کی بارگاہ میں زمزمہ باریاب تھا

سر پہ صُراحیاں لیے رقص کُناں تھے مُغبچے
نرگسِ نیم باز میں، رنگِ شرابِ ناب تھا

زُلف میں بھی تھی برہمی، دل کو بھی پیچ و تاب تھا
معرکۂ عظیم تھا ناز میں اور نیاز میں

موجِ ہوا میں عطر تھا، چھٹکی ہوئی تھی چاندنی
پھول تھے صحنِ باغ میں، چرخ پہ ماہتاب تھا

عشق کی نبضِ تیز میں دوڑ رہی تھیں بجلیاں
حسن کے دستِ ناز میں شعلہ فشاں رباب تھا

پرتوِ یار اس طرف، رامش و رنگ اس طرف
چشم بھی فتح مند تھی، گوش بھی کامیاب تھا

دردسے قلب چُور تھے، کیف سے رُوح مست تھی
سوز بھی بے نظیر تھا، ساز بھی لاجواب تھا

ہونٹوں کو وقتِ گفتگو چُومتی تھی شگفتگی
بات جو تھی، سو پھول تھی، پھول جو تھا گلاب تھا

اور سحر کو، ہم نشیں! آنکھ کھلی تو کیا کہوں
طاق میں شمعِ کشتہ تھی، چرخ پہ آفتاب تھا

توبہ شکن گلابیاں فرش پہ چور چور تھیں
خلد فروش جامِ زر، شرم سے آب آب تھا

نغمہ، رقص و بے خودی، جلوۂ حسن و شاعری
شب کو تھا بحرِ بے کراں، وقتِ سحر سراب تھا

بربط و چنگ کی صدا ایک فسردہ گونج تھی
شمع و شراب کا سماں ایک پریدہ خواب تھا

لرزشِ بادہ و خمِ زلفِ سیاہ کے عوض
تھا تو چراغِ کشتہ کے دود کا پیچ و تاب تھا

گنبدِ قصرِ عیش میں گونج رہی تھی یہ صدا
رات نہ تھی وہ کیف کی، جوشؔ ترا شباب تھا!

جوانی کے سازو برگ

(سنہ ۱۹۲۹ء)

کچھ کسک سی دل میں، کچھ آنکھوں میں آنسو آبدار — گاہ دردِ بے نوائی، گاہ کربِ انتظار
ہجر کی کچھ خشمگیں تاریکیوں کا پیچ و تاب — وصل کی کچھ دل نشیں راتوں کا نورِ ماہتاب
چند وقفے خوش دلی کے، چند گھڑیاں جبر کی — کچھ تمنائیں شبِ مہتاب و روزِ ابر کی
کچھ لگاوٹ، کچھ ستم، کچھ نرمیاں، کچھ گرمیاں — گاہے ماہے چند راتیں مہ وشوں کے درمیاں
کچھ دنوں تلخ و زبوں شامِ بلا کی تیرگی — کچھ شبوں میں پھول سے مکھڑوں کی میٹھی چاندنی
کچھ دنوں تک ظلمتِ ہول آفریں گرمِ عتاب — چند لمحے کچھ سنہری کنگنوں کی آب و تاب
گہ تمناؤں کے انگارے دلِ صد چاک میں — جستجو کی گہ خراشیں دیدۂ نمناک میں
چند سانسیں ہجر کی چلتی ہوئی تلوار پر — چند نیندیں روح فرسا کروٹوں کی دھار پر
کچھ فراغت کی امنگیں، کچھ مسرت کی نمو — زانوؤں کے چند تکیے، کچھ تبسم کے سبو
دو گھڑی کے واسطے احباب سے راز و نیاز — چند لمحوں کے لیے گل رنگ باہنوں کا گداز
چند لحظے بے دلی کے، چند وقفے طیش کے — چند جرعے سرخوشی کے، چند نغمے عیش کے

کچھ دنوں بھیگی ہوئی راتوں کا لطف بے قیاس
شکّریں باتوں کا رس، شاداب چہروں کی مٹھاس

کچھ تبسّم، نرم کلیوں کی طرح کھلتے ہوئے
چند چہرے، چودھویں کے چاند سے ملتے ہوئے

ساعدوں کی چند شمعیں، عارضوں کے کچھ گلاب
کچھ زبوں کی سرخیاں، کچھ مست آنکھوں کی شراب

کچھ خنک لہجوں کی شبنم، کچھ ترانوں کی پھوار
کچھ لبوں کا شہد، کچھ زلفوں کا عطرِ مشکبار

لطف کے دو ایک دن، تفریح کی ایک آدھ رات
اے جوانی! تھی تری لے دے کے اتنی کائنات!

پھر بھی وہ تیرا سبک پرواز عہدِ مختصر
خندہ زن ہے آج تک عمرِ مسیح و خضر پر

وقت کی خوں ریزیوں پر، بڑھ کے پانی پھیر دے
ان دنوں کی ایک ہی شب، اے جوانی پھیر دے

نظّارۂ ماضی

(سنہ ۱۹۲۷ء)

دیوی ہے سحر کی جلوہ گُستر
جھونکے ہیں نسیم کے مُعطّر

خاموش ندی پہ ہے دُھواں سا
سبزے پہ ہے دُھوپ کا گُماں سا

کیا مست ہوائیں آ رہی ہیں
"کُو کُو" کی صدائیں آ رہی ہیں

پڑتا ہے اثر نہ جانے کیونکر
کوئل کی صدا کا حافظے پر

ظالم کی صدا سے دل کے اندر
کُھلتا ہے گزشتہ عہد کا در

کیا حال سے "جوش" دل ہو راضی
پھرتا ہے نظر میں دَورِ ماضی

احساس میں کیا رہے توازن
سینے کی گرہ، صدا کا ناخن

ہیں پیشِ نظر قدیم ہمراز
"شکلوں" میں ڈھل رہی ہے "آواز"

راتیں وہ خُنک، وہ سرد صبحیں
بیدار ہوئی ہیں میرے دل میں

رگ رگ میں بپا ہے اک تلاطم
ہاں ہاں یہ انھیں کا ہے تبسّم!

آئینۂ شوخی و جوانی
تھا جس پہ مدارِ زندگانی

جس کی آنکھیں تھیں دورِ ساغر
ہاں ہاں یہ وہی ہے ماہ پیکر!

لب پر جو بنی ہوئی ہیں آہیں
یہ تو ہیں اس کی بزم با نہیں!

تانیں یہ سرور کی سُریلی
لہجے میں جھجک یہ کمسنی کی!

سامان تھے سب یہ اتفاقی
اب صرف "خیال" میں ہیں باقی

ان میں ہیں کچھ کہ سو رہے ہیں
کچھ "شعر" میں صرف ہو رہے ہیں



ایک قدیم سیرگاہ کو دیکھکر

(سنہ ۱۹۳۳ء)

آ نکلے ہو تو، دم بھر ٹھہرو ذرا عزیزو
ہم اس زمیں پہ کیا کیا فتنے جگا چکے ہیں

کیسی یہ جلد بازی، دم بھر تو سوچنے دو
یاں دامنوں کے کیا کیا پرزے اڑا چکے ہیں

ہاں، یہ وہی ندی ہے جس میں نہا نہا کر
کتنے ہی ساونوں میں طوفاں اٹھا چکے ہیں

ساحل پہ کرم خوردہ یہ کشتیاں وہی ہیں
جن میں خم و سبو سے دریا بہا چکے ہیں

یہ سبزہ ہے، جہاں ہم سوئے ہوؤں کے منھ پر
صہبا چھڑک چھڑک کر اکثر جگا چکے ہیں

ہاں، یہ وہی چمن ہے، جس میں فروغ مے سے
کلیاں سی کمسنوں کے رخ پر کھلا چکے ہیں

دیکھو یہ سائباں ہے، جس سائباں کے نیچے
کیا کیا جوانیوں کی عیدیں منا چکے ہیں

ہاں، اس طرف یہ دیکھو رنگین وادیاں ہیں
ان وادیوں میں کیا کیا دھومیں مچا چکے ہیں

ہاں اے جوشؔ یہ مناظر قایم رہیں ابد تک
اس رنگ و بو میں کیا کیا معشوق آ چکے ہیں

مُفلسوں کی عید

(سنہ ۱۹۳۲ء)

اہلِ دوَل میں دُھوم تھی روزِ سعید کی
مُفلس کے دل میں تھی نہ کرن بھی اُمید کی
اتنے میں اور چرخ نے مٹّی پلید کی
بچّے نے مُسکرا کے خبر دی جو عید کی
فرطِ محن سے نبض کی رفتار رُک گئی
ماں باپ کی نگاہ اُٹھی، اور جھک گئی

آنکھیں جُھکیں کہ دستِ تہی پر نظر گئی
بچّے کے ولولوں کی دلوں تک خبر گئی
زُلفِ ثبات، غم کی ہوا سے بکھر گئی
برچھی سی ایک، دل سے جگر تک اُتر گئی
دونوں، ہجومِ غم سے ہم آغوش ہو گئے
اک دوسرے کو دیکھ کے خاموش ہو گئے

———•••———

مختار احمد خاں[1]

(سنہ ۱۹۲۲ء)

اے رفیقِ شفیق، اے مختار | میرے دیرینہ مونس و غمخوار

بذلہ سنج و ظریف و نکتہ شناس | خوش دل و خوش بیان و خوش گفتار

اے کہ سودائے عشق تیرا چلن | اے کہ ذوقِ نگاہ تیرا شعار

اے کہ سینے میں تیرے خوابیدہ | میرے طفلی کے ساز کی جھنکار

ہائے وہ سرزمینِ سیتاپور | ہائے وہ لکھنؤ کے لیل و نہار

ہائے وہ "انجمن" کی شامِ طرب | ہائے وہ گومتی کی صبحِ بہار

ہائے "لاٹوش روڈ" کے خم و پیچ | ہائے نخّاس کے در و دیوار

ہائے بوٹا سا وہ عزیز[2] کا قد | ہائے کھلتا سا وہ رُخِ دیدار[3]

ہائے وہ "پار"[4] کے رُخ و کاکل | ہائے وہ چوک کے لب و رُخسار

ہائے وہ سبزۂ امین آباد | ہائے وہ چار باغ کے انوار

ہائے وہ گُل رخانِ کلکتہ | ہائے وہ مہ وشانِ "شالامار"

---

[1] مختار احمد خاں آحمد ملیح آبادی [2] عبدالعزیز خاں ملیح آبادی جو بہ غایت پستہ قد واقع ہوئے ہیں [3] دیدار حسن خاں ملیح آبادی [4] لکھنؤ کا ایک محلہ جو گومتی کے اُس پار واقع ہے۔

ہائے وہ بد مذاقیٔ "مُلّا"[1] ہائے وہ کج ادائیٔ اغیار

ہائے وہ شورشِ رفیع[2] و شرر[3] ہائے وہ بذلہ سنجیٔ ابرار[4]

ہائے وہ سازِ میرزا[5] و نذیر[6] ہائے وہ سوزِ عشق و موجِ ستار

ہائے روئے "شریف"[7] کی سُرخی ہائے نور الحسن[8] کی شانِ وقار

وہ ظفر[9] کا خرامِ بے پروا وہ عطا[10] کی جبینِ صاعقہ بار

ہائے گم ہو گئے کدھر وہ دن؟ ہائے کیا ہو گئے وہ لیل و نہار؟

تُو مُورّخ ہے عہدِ ماضی کا

عمرِ رفتہ کا تُو فسانہ نگار

تجھ میں مضمر مری حکایتِ گُل تجھ میں پنہاں مری حدیثِ بہار

"تُو سلامت رہے ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

---

[1] نام یاد نہیں، لاٹوش روڈ کی پشت پر رہتے تھے اور ہماری خوش مذاقیوں سے ناخوش رہا کرتے تھے [2] رفیع احمد خاں ایم۔اے سابق پروفیسر کیننگ کالج لکھنؤ [3] احسن میرزا صاحب شرر لکھنوی [4] ابرار حسن خاں آثر ملیح آبادی [5] شاہزادہ میرزا جہانگیر قدر بی۔اے ڈپٹی کلکٹر [6] شیخ محمد نذیر صاحب جو کچھ دن ملیح آباد میں ہیڈ ماسٹر رہ چکے ہیں [7] محمد شریف ایک دوست [8] نور الحسن خاں ملیح آبادی [9] ایک ہم مدرسہ دوست [10] عطا حسین لکھنوی خلف میرزا قاسم حسین ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس

مختار[1]! واپس آ

(سنہ ۱۹۲۵ء)

اے سمندر! اے شبِ مہتاب کے آئینہ دار
تیری چوپاٹی پہ ہر جنبش ہے پیغامِ بہار

سوئے مغرب تیرے سینے پر رواں ہے اک جہاز
عشق کی دنیا میں ہے جو کعبۂ سوز و گداز

آہ اُس میں اک مسافر ہے شہیدِ آرزو
کشتۂ موجِ ہوائے گل، ہلاکِ رنگ و بو

اے سمندر! رہتی دنیا تک رہے تو شاد کام
اسکو لہروں کی زبانی میرا پہونچا دے پیام

رو کے یہ کہنا کہ اے شاعر کے دیرینہ حبیب
اے بلاکش، اے وطن آوارہ، اے حرماں نصیب!

اے زمانے کی ہزاروں سختیاں جھیلے ہوئے
اے مرے ہمراز، میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے

بمبئی، تیری زیارت کے لئے آیا تھا میں
دل میں اک دنیا ہجومِ شوق کی لایا تھا میں

ابرِ غم میں چھپ گئی کشتی ہلالِ عید کی
رہ گئی گھٹ کر مرے دل میں تمنا دید کی

کس طرف لیکر چلا ہے تجکو قلبِ ناصبور؟
آہ اے چشم و چراغِ دودمانِ رامپور[2]

تو سوئے لندن رواں ہے بے ندیم و غمگسار
اور کن حالات میں، جن کا تصور ناگوار

---

[1] مختار احمد خاں احمد ملیح آبادی [2] یہ معزز خاندان رامپور سے آکر ملیح آباد میں آباد ہوا تھا۔

رونے والے! وہ تری خلقی ظرافت کیا ہوئی؟ وہ ترے اجداد کی شانِ امارت کیا ہوئی؟
اب تک آویزاں ہیں وہ نقشے دلِ برباد میں آہ جب رہتے تھے ہم دونوں ملیح آباد میں
لکھنؤ کی آج بھی وہ رنگ ریاں دل میں ہیں پہلے جو زیرِ قدم تھیں اب وہ گلیاں دل میں ہیں
ہائے سیتا پور کی وہ روح پرور سرزمیں ہے خیرآباد کے وہ مہ وشانِ شرمگیں
وہ ہوائیں، وہ گھٹائیں، وہ فضا کچھ بھی نہیں اب فقط اک داغِ ماضی کے سوا، کچھ بھی نہیں
اے مریضِ دردِ دل، اے عاشقِ آشفتہ کار آہ یہ صدمے، تری مجبوریوں کے ہیں نثار
اُف یہ کیسا پیچ ہے تقدیر کا ڈالا ہوا یوں نہ محنت کر، کہ تو نازوں کا ہے پالا ہوا

گوش برآواز ہوں تیری صدا کے واسطے
جلد اے مختار واپس آ، خدا کے واسطے

الوداع[1]

(سنہ ۱۹۲۴ء)

اے ملیح آباد کے رنگیں گلستاں، الوداع　　الوداع، اے سرزمینِ صبحِ خنداں، الوداع
الوداع، اے کشورِ شعر و شبستاں، الوداع　　الوداع، اے جلوہ گاہِ حُسنِ جاناں، الوداع

تیرے گھر سے ایک زندہ لاش اُٹھ جانے کو ہے
آ گلے مِل لیں کہ آوازِ جرس آنے کو ہے

آ، کلیجے میں تجھے رکھ لوں مرے "قصرِ سحر"[2]　　اس کتابِ دل کے ہیں اوراق تیرے بام و در
جا رہا ہوں تجھ میں کیا کیا یادگاریں چھوڑکر　　آہ کتنے طُور خوابیدہ ہیں تیرے بام پر

روح، ہر شب کو نکل کر میرے جسمِ زار سے
آ کے سر ٹکرائے گی تیرے در و دیوار سے

ہائے کیا کیا نعمتیں مجکو ملی تھیں بے بہا　　یہ خموشی، یہ کھُلے میدان، یہ ٹھنڈی ہوا
وائے یہ جاں بخش بستاں، ہائے یہ رنگیں فضا　　مر کے بھی اِن کو نہ بھولیگا دلِ درد آشنا

---

[1] دکن جاتے ہوئے یہ نظم کہی گئی تھی۔ [2] مصنف کے مکان کا نام۔

مست کوئل جب دکن کی وادیوں میں گائیگی
یہ سبک چھاؤں ببولوں کی بہت یاد آئیگی

کل سے کون اس باغ کو رنگیں بنانے آئیگا
کون پھولوں کی ہنسی پر مسکرانے آئیگا

کون اس سبزے کو سوتے سے جگانے آئیگا
کون ان پودوں کو سینے سے لگانے آئیگا

کون جاگے گا قمر کے ناز اٹھانے کے لئے
چاندنی راتوں کو زانو پر سلانے کے لئے

آم کے باغوں میں جب برسات ہوگی پرخروش
میری فرقت میں لہو رویگی چشمِ مے فروش

رس کی بوندیں جب اڑادینگی گلستانوں کے ہوش
کنج رنگیں میں پکارینگی ہوائیں "جوش، جوش!"

سنکے میرا نام، موسم غمزدہ ہو جائیگا
ایک محشر سا گلستاں میں بپا ہو جائیگا

صبح، جب اس سمت آئیگی برافگندہ نقاب
آہ کون اس دل کشا میدان میں چھیڑیگا رباب

اِس اُفق پر شب کو جب انگڑائی لیگا ماہتاب
چاندنی کے فرش پر لہرائیگا کس کا شباب

جگمگائیگی چمن میں پنکھڑی کس کے لئے
رنگ برسائیگی ساون کی جھڑی کس کے لئے

گھر سے بے گھر کر رہی ہے آہ فکرِ روزگار
سرنگوں ہے فرطِ غیرت سے اب وجد کا وقار

خلعتِ ماضی ہے جسمِ زندگی پر تار تار
پھر بھی آنکھوں میں ہے آبائی آثار کا خمار

شمع، خلوت میں ہے روشن، تیرگی محفل میں ہے
رُخ پہ گردِ بیکسی، شانِ ریاست دل میں ہے
کوچ کا پیغام لیکر آگیا مہرِ منیر گھر کا گھر ہے وقفِ ماتم، زرد ہیں بُرنا و پیر
رخصتِ بُلبل سے نالاں ہیں چمن کے ہمصفیر آرہی ہے کان میں آوازِ گویا و بشیر
چھُٹ رہا ہے ہات سے دامن ملیح آباد کا
رنگ فق ہے عزّتِ دیرینۂ اجداد کا
کیا بتاؤں، دل پھٹا جاتا ہے میرا ہمنشیں! آئینگے یاں خرمنِ اجداد کے جب خوشہ چیں
آکے دروازے پہ جیسے ہی جھکائینگے جبیں گھر کا سنّاٹا صدا دیگا "یہاں کوئی نہیں"!
جُود و بخشش کا کلیجہ غرقِ خوں ہو جائیگا
میرے گھر کا پرچم زرِ سر نگوں ہو جائیگا
آہ اے دورِ فلک! تیرا نہیں کچھ اعتبار مِٹ کے رہتی ہے ترے جورِ خزاں سے ہر بہار
نوعِ انساں کو نہیں تیری ہوائیں سازگار فکرِ دُنیا، اور شاعر، تُف ہے اے لیل و نہار
موجِ کوثر وقف ہو، اور تشنہ کامی کے لیے!
خواجگی رختِ سفر باندھے غلامی کے لیے!

۵۳ حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں التخلص بہ گویا۔ ۵۴ نواب محمد بشیر احمد خاں بشیر رئیس اعظم ملیح آباد۔

آ، گلے مِل لیں، خدا حافظ گلستانِ وطن
اے "اماّنی گنج" کے میدان[۵] اے جانِ وطن
الوداع اے لالہ زار و سنبلستانِ وطن
السّلام اے صحبتِ رنگینِ یارانِ وطن

حشر تک رہنے نہ دینا تم دکن کی خاک میں
دفن کرنا اپنے شاعر کو وطن کی خاک میں

---

[۵] وہ میدان جہاں مصنف نے نظارہ مناظر کی خاطر آبادی سے باہر مکان تعمیر کیا تھا۔

غریب الوطن کا پیام

(سنہ ۱۹۲۵ء)

اے چاند! جگمگا کر مکھڑا دکھانے والے
غرفے سے آسماں کے، اے مسکرانے والے

عالم کی کیا حقیقت تیرے سفر کے آگے
اس وقت اک جہاں ہے تیری نظر کے آگے

جکڑا ہوا پڑا ہوں زنجیر سے دکن کی
سینے میں آرزو ہے بچھڑے ہوئے وطن کی

کس زندگی کی دُھن میں پیہم رواں دواں ہیں؛
جو ساتھ کھیلتے تھے، وہ لوگ اب کہاں ہیں؟

شاداب تو ہیں میرے بچپن کی سیرگاہیں؟
اب ڈھونڈتی ہیں جن کو ترسی ہوئی نگاہیں

اچھی تو ہیں پروں کو دُھن میں جھٹکنے والی
دیوار پر وہ آکر چڑیاں چہکنے والی؟

چھائی ہیں میرے دل پر کیوں بدلیاں محن کی؟
مجروح تو نہیں ہیں صُبحیں مرے وطن کی؟

"میدا[1]" تو میرے غم میں کھویا ہوا نہیں ہے؟
"قصرِ سحر[2]" کا مُنھ تو اُترا ہوا نہیں ہے

محفوظ تو ہیں اب تک طوفانِ کارواں سے
ترشی ہوئی وہ راہیں کھیتوں کے درمیاں سے؟

کیا اب بھی جھومتی ہیں کرتی ہوئی اشارے
پتلی سُبک بیلیں تالاب کے کنارے؟

بدلی میں گونجتے ہیں آموں کے باغ اب بھی؟
جلتے ہیں جنگلوں میں دُھندلے چراغ اب بھی؟

---

[1] امانی گنج کا میداں جہاں مصنف نے نظارۂ قدرت کی خاطر مکان تعمیر کیا تھا۔ [2] مصنف کے مکان کا نام۔

اے چاند جب ستارے گردوں پہ جھلملائیں
جب قدرتی مناظر صحرا میں مسکرائیں

تاروں کی کشمکش میں جب چاندنی ہو پھیکی — چادر سرک گئی ہو ماتھے سے جب کسی کی
بے داغ جب زمیں ہو، اور آسمان کورا — جب سینۂ اُفق پر غلطاں ہو سُرخ ڈورا
مغموم جھاڑیوں سے میرا سلام کہنا — آنکھوں میں اشک بھر کر پھر یہ پیام کہنا
کیوں میرا سوزِ فرقت تم کو جلا رہا ہے؟ — کیوں مضطرب ہو؟ ٹھہرو، وہ دن بھی آ رہا ہے

جس دن دھڑکنے والے دل کو قرار ہوگا
سائے میں جب تمہارے میرا مزار ہوگا!



ٹھنڈی انگلیاں

(۱۹۲۵ء)

سرد انگلی اپنے مفلس باپ کی پکڑے ہوئے
رو رہا ہے ایک بچہ اک دکاں کے سامنے

اک کھلونے کی طرف انگلی اٹھا کر بار بار
کچھ نہیں کہتا ہے، لیکن رو رہا ہے زار زار

باپ کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں ہے دنیا سیاہ
رخ پہ گرد مفلسی ہے، جیب خالی پر نگاہ

باپ کی نمناک آنکھوں میں ہے تکمیل یاس
کیا قیامت ہے پسر کے آنسوؤں کا انعکاس

دل ہوا جاتا ہے بچے کے بلکنے سے فگار
کہہ رہا ہے زیر لب فریاد اے پروردگار

واہ کیا تقدیر ہے اس بندۂ معصوم کی
ہو چلی ہیں انگلیاں ٹھنڈی مرے معصوم کی

یہ کھِلونا؟

(سنہ ۱۹۲۵ء)

یہ کھِلونا؟ نہیں، مرے معصوم — آگ اِس کو سمجھ کے دُور سے تاپ
میرے ننّھے سے ماہتاب! نہ رو — آ، سُلا دے تھپک کے مُفلس باپ

درد انگیز کھلونا

(سنہ ۱۹۲۵ء)

ہاں، یہی ہے وہ کھلونا اے دلِ آشفتہ حال
کھیلتا پھرتا ہے جس سے ایک طفلِ خورد سال

ہاں، یہی ہے وہ کھلونا، دیکھ چشمِ اشک بار
جس کی حسرت میں مرے بچّے کا دل ہے بیقرار

اس کھلونے کی سبک گل کاریوں کے درمیاں
ثبت ہیں اک تیرہ قسمت باپ کی محرومیاں

اس کا آبِ رنگ ہے آئینۂ عبرت فزا
یہ مگر رنگ پریدہ ہے کسی مایوس کا

اس کے آئینوں میں ٹکڑے ہیں دلِ محروم کے
اس کی تابانی میں آنسو ہیں کسی معصوم کے

اس میں غلطاں ہے کسی بچّے کا شوقِ مضمحل
اس کے سینے میں دھڑکتا ہے کوئی ننھا سا دل

کھیل دولت مند بچّے! تو سدا پھولے پھلے
ہم ادھر ہنستے ہوئے آئے تھے اور روتے چلے

انگیٹھی

(۱۹۲۸ء)

بچپن کی اے اُداس انگیٹھی! خدا گواہ
کیا کہیے تجھ پر آج پڑی کس طرح نگاہ

تُو اور خاکِ سرد پہ یوں مثلِ سوگوار!
افسوس اے زمانۂ طفلی کی یادگار

میری ہی طرح کیا ترا پہلو بھی سرد ہے؟
کیا تیرے آئینے پہ بھی ماضی کی گرد ہے؟

افسوس وہ نشاط کے موسم، وہ زمزمے
جاڑوں کی دلفریب وہ راتیں، وہ چہچہے

شعلوں سے تیرے، ہائے وہ اُٹھتا ہوا دھُواں
وہ قہقہوں کی گونج وہ شیریں پہیلیاں

خوشبو وہ تیری آنچ کی جاں بخش و دل نواز
وہ تیرگی میں رنگ ترا، دل میں جیسے راز

شعلے وہ سُرخ سُرخ، دلوں میں تلے ہوئے
وہ سُرخیوں میں نرم تبسّم کھُلے ہوئے

شعلوں کے بار بار وہ اندازِ دل نشیں
دم بھر میں زرنگار، تو دم بھر میں سُرمگیں

ڈوبی ہوئی حیات میں تیری وہ گرمیاں
وہ گرمیوں میں لُطف کے قصّوں کی نرمیاں

وہ سادگی کی بزم میں بجتے ہوئے ستار
کلیوں کا کوئلوں کی چٹکنا وہ بار بار

وہ غُنچگی کا عہد، وہ گُل باریاں تری
اُڑتی ہوئی ہوا میں وہ چنگاریاں تری

وہ نرم نرم جسم، وہ تیری حرارتیں
وہ ذمّہ داریوں سے مُعرّا شرارتیں

وہ چھوکرے، ادب سے دروں میں کھڑے ہوئے
دایاؤں کے سروں پہ وہ آنچل پڑے ہوئے

ماماؤں کی صفوں میں وہ مغلانیوں کی شان
رکھا ہوا وہ تخت پہ چاندی کا پاندان

وہ تیرے گرد و پیش، بصد شانِ افتخار
آواز پاندان کے کھلنے کی بار بار

شایانِ آفریں وہ خواتین کا شعار
شوخی کے رنگ میں بھی وہ اک نوع کا وقار

وہ ہنسلیں گلوں میں، لبوں پر وہ لالیاں
ہلتی ہوئی وہ کانوں میں سونے کی بالیاں

وہ لونڈیوں کے رخ پہ نشاں خاک دھول کے
جوڑے وہ اونچے اونچے، وہ موباف تول کے

وہ مرد و زن لحافوں کے اندر گھٹے ہوئے
رعب آفریں دروں میں وہ پردے چھٹے ہوئے

وہ نچلے بیٹھنے سے طبیعت کا انتشار
پہلو رضائیوں میں بدلنا وہ بار بار

ہلکی رضائیوں کی وہ افسانہ باریاں
اطلس کی سرخ گوٹ پہ وہ سرخ دھاریاں

وہ "ایک بادشاہ" کی بیٹی کا ذکرِ خیر
وہ ولولے جنوں کے، وہ پریوں کا شوقِ سیر

وہ حسرت میں غرق بڑی بوڑھیوں کی ذات
وہ کاٹنا ڈلی کا کہانی کے ساتھ ساتھ

وہ اک عجیب شانِ طرب سے ہلی ہوئی
شیریں حکایتوں میں مسرتوں کی راگنی

کیوں، اب بھی یاد ہیں وہ لڑکپن کے زمزمے؟
اے شمعِ خوابگاہِ فراغت جواب دے!

جن کو بھلا رہی ہیں ہماری جوانیاں
اب اُن میں تجھکو یاد ہیں کتنی کہانیاں؟

اُترے ہوئے چہرے

(سنہ ۱۹۳۰ء)

آہ وہ لوگ کہ تھے میرے لڑکپن میں ظریف
جن کو ہنسنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا

میرے آبا کی لگاتار نوازش کے طفیل
رنگ رلیوں ہی میں کٹتا تھا زمانہ جن کا

اُن کے بعد اب ہیں کچھ اس درجہ ملول و غمناک
کہ انھیں دیکھ کے پھٹتا ہے کلیجہ میرا

میرا افلاس ملاتا نہیں اب اُن سے نگاہ
میرے اجداد کی دولت کا تھا جن پر سایا

جس سے رہتی تھی شریفوں کے خط و خال میں آب
کیا ہوا، دورِ فلک! وہ مرے گھر کا نقشا

دیکھتی کاش جوانی بھی مری شاد انھیں
مست تھا جن کے لطیفوں سے لڑکپن میرا

دستِ خالی کی طرف دیکھ کے رہ جاتا ہوں
اُن کا چہرہ نظر آتا ہے جب اُترا اُترا

آہ اُن میں سے ہر اُترا ہوا چہرہ اے جوشؔ
مقبرہ ہے مرے اجداد کی فیاضی کا

فرطِ غم سے قدم اُٹھتے نہیں بڑھنے کے لیے
کتنی قبریں ہیں یہاں فاتحہ پڑھنے کے لیے!

ماں جائے کی یاد

(سنہ ۱۹۳۰ء)

ہیں دیس میں، تم وطن سے باہر
اے بھائی! بہن نثار تم پر

انگنائی میں ہو رہا ہے غوغا
ساون کی ہے رُت، ہوا ہے پُروا

سائے میں گرجتی بدلیوں کے
استادہ ہیں دو شریر بچّے

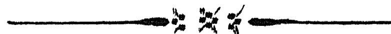
اِک مَعج رواں ہے، اک چمن ہے
اک خیر سے بھائی، اک بہن ہے

کچھ دیر سے دونوں لڑ رہے ہیں
کیا جانیئے کیوں جھگڑ رہے ہیں

میں دیکھ رہی ہوں، اور چُپ ہوں
کِس جی سے بھلا فساد کاٹوں

اِس جنگ کے آئینے کے اندر
بچپن ہے ہمارا جلوہ گُستر

کرتے تھے شرارتیں، اُدھم بھی
لڑتے تھے اسی طرح سے ہم بھی



بہن کی یاد

(سنہ ۱۹۳۳ء)

کندہ ہے اس ظرفِ شکستہ پہ یارب! کس کا نام؟
آہ، اب اِس نام کا مفہوم ہے زیرِ مزار

دل بیٹھا جاتا ہے میرا، آہ اے ظرفِ ملول
آ کہ رکھ لوں دل میں اے میری بہن کی یادگار

وہ بہن، شاداب تھے جس سے روایاتِ قدیم
وہ بہن، تابندہ تھا جس سے اب وجد کا وقار

اِس کے حرفوں پہ نظر پڑتے ہی اک مدّت کے بعد
پھر گئی آنکھوں کے نیچے عہدِ طفلی کی بہار

دائروں میں اِس کے، ماضی کو مچلتا دیکھ کر
ہوگیا کچھ اور بھی دُکھتا ہوا دل بیقرار

خُون رو، اے میری قبل از وقت پیری! خُون رو
اِس کے نقطوں سے ہے بچپن کا تلاطم آشکار

گھر کی انگنائی میں گویا کھیلتا پھرتا ہوں میں
دل کو رہ رہ کر یہ دھوکا ہو رہا ہے بار بار

نیم میں جھولا پڑا ہے، پک رہی ہیں پُوریاں
پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی مست بھادوں کی پھُوار

پینگ لے لے کر مزے سے گا رہے ہیں باغ میں
"نیم کی نکولی پکّی، آئی ساون کی بہار"

"میکے لینے آگیا، جگ جگ جیئے بیرن مرا"
رکھ دے اس طوفان میں نبوا تلے ڈولی کہار"

صحن میں پانی بھرا ہے، اور پائیں باغ سے
آ رہی ہے بارہ ماسے کی صدا دیوانہ وار

دبجود، سینے میں رہ رہ کر بھر آتا ہے دل — گو سمجھ میں کچھ نہیں آتی پپیہے کی پکار

چھوڑ دو، طفلی کے لمحو! مجکو تنہا چھوڑ دو
صبر و تمکیں کا ہوا جاتا ہے دامن تار تار

عیتے جیتے ہو چکے ہیں جوش کو چھتّیس سال — ایک دل اور اتنے ماہ و سال کا پُر ہول بار!

ادے معبود! اس دردِ نہاں کی داد دے — یہ لطیف احساس، یہ طولِ حیاتِ مُستعار

ندگی! اُف زندگی!! سینے میں گھبراتا ہے دم — خالقِ جاں! توڑ دے اِس قید خانے کا حصار

ب ستارہ ٹوٹ جاتا ہے، قسم اُس وقت کی — تیر، مرگِ ناگہاں کا تیر، میں تیرے نثار

رحم فرما، زہرِ ہستی اب پیا جاتا نہیں
اب ترے بندے سے اے مولا! جیا جاتا نہیں

— • • • —

خُدا سے ایک سوال

(سنہ ۱۹۲۲ء)

مادّی عہد میں یہ ناداری
کون اپنی کریگا غمخواری

کِس طرف جائیں کِس سے بات کریں
ہر طرف اک جمود ہے طاری

کِس سے کہیے کہ اپنی صحّت ہے
بدتر از صد ہزار بیماری

اہلِ افلاس غرقِ رشک و حسد
اہلِ دولت رہینِ غدّاری

اُٹھ گیا ہائے دوستی کا چلن
لُٹ گیا ہائے شہرِ دلداری

جس کے چہرے پہ فکر کے آثار
اُس کی صورت سے سب کو بیزاری

مطمئن ہستیوں کا دُنیا میں
مشغلہ ہے غریب آزاری

قدرداں کون ہے زمانے میں
علم و فن کی ہے سربازاری

افترا ہے وسیلۂ توقیر
راستی وجہِ ذلت و خواری

حجِ اکبر، طوافِ کعبۂ زر
حمد و تہلیل، حرفِ عیّاری

جزوِ ایماں، مذاقِ بُغض و نفاق
راہِ عرفاں، شعارِ مکّاری

نظر آتی ہے اہلِ دانش میں
سیرتِ شاہدانِ بازاری

مایۂ صد نشاطِ روحانی
اہلِ دولت کی کفش برداری

اپنی تحمیل سے ہے شرمندہ
میری تخیُّل کی فُسوں کاری

بے خبر سو رہی ہے اک دُنیا
مُنفعِل ہے ہماری بیداری

فرقِ اغیار پر چمکتا ہے
ہند کا افسرِ جہانداری

اِس تلاطم میں ہم ادیبوں کی
کیا ضرورت تھی ایزدِ باری؟

مطالعہ و نظر

دیدہ ور آنکہ، تا نہد دل بشمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد، رقصِ بتانِ آذری

(غالب)

گرہ یوں کھل رہی ہے ہر نفسِ ذوقِ نظارہ کی
کہ ہر ادنیٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے

(جوشؔ)

(۱)

حوض میں مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح
کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہگزار
حافظے پر یونہیں اک بیدار کُن گہری خراش
ڈال دیتی ہے شبِ غم میں پپیہے کی پکار

---

(۲)

مُسکرایا خواب میں اس طرح اک طفلِ صبیح
جس طرح صہبا کی لرزش سے دمک اُٹھّے ایاغ
اور اس نرمی سے، جیسے بتکدے کے طاق میں
جھٹپٹا ہوتے ہی روشن کر دیا جائے چراغ

---

(۳)

خاکِ گلشن پہ دُھندلکے کی المناکی میں
یوں ہیں پامال شگوفوں پہ نقوشِ بیداد
عید کے چاند پہ جس طرح نظر پڑتے ہی
دل میں معصوم یتیموں کے ہو، ماں باپ کی یاد

---

(۴)

رکھّے ہوئے سونے کا طبق، ناز سے سر پر
کہرے میں نظر آتی ہے، یوں صبح درخشاں
ہو جاتی ہے جس طور سے انسان کی شرافت
ہنگامۂ افلاس میں کچھ اور نمایاں

(۵)

ساحلِ عثمان[۵] ساگر کی چٹانوں پہ سے موج
یوں گزر جاتی ہے اکثر برق کی رفتار سے
جیسے اُٹھتی ہے دلِ مفلس میں موجِ انبساط
اور اُٹھتے ہی گزر جاتی ہے قلبِ زار سے

---

(۶)

کثرتِ عصیاں کی گہری تیرگی میں گاہ گاہ
سامنے آتی ہے فکرِ عاقبت، یوں بے نیام
جیسے حملے کے لئے بیتاب ہو کے شیر کی
جھاڑیوں میں سے چمک اُٹھتی ہیں آنکھیں وقتِ شام

---

(۷)

وداعِ طفلی و قربِ شباب کے باعث
تری "نگاہ" ہے یا وہ "خیالِ" دل افروز
بدل رہا ہے جو پہلو ضمیرِ شاعر میں
اور آب و تاب سے موزوں نہیں ہوا ہے ہنوز

---

(۸)

رہروؤں کو دُور سے پہچاننے کیواسطے
سعی کی جاتی ہے یوں دھندلی شبِ مہتاب میں
جسطرح انسان کی سیرت پرکھنے کیلئے
ٹھوکریں کھاتی ہیں نظریں ظاہری آداب میں

۵؎ حیدرآباد کا ایک نظر فریب تالاب ۱۲

(۹)

بنا چکتا ہے جب نو مشق، اک حلقہ سا تودے پر
نشانہ باندھ کر چٹکی میں اپنی، تیر لیتا ہے

چلانا چاہتا ہے یونہیں غم جس پہ چھری اپنی
خوشی کا ہار پہلے اُس گلے میں ڈال دیتا ہے

---

(۱۰)

اب بھی فکروں سے اگر دم بھر کو پاتا ہوں نجات
ناتواں دل میں کھٹک جاتی ہے یوں یادِ بہار

صُبح، کچی نیند سی جس طرح چونک اُٹھنے کے بعد
کمسنی کی بھول سی آنکھوں میں چبھتا ہے خمار

---

(۱۱)

چاند جب گردوں پہ آتا ہے برافگندہ نقاب
دفعتہً کجلا سے جاتے ہیں ستاروں کے شرار

روبرو یونہیں جب آجاتا ہے وہ ماہِ تمام
ماند پڑ جاتے ہیں آنکھوں میں سرشکِ انتظار

---

(۱۲)

وصل کی راتوں میں اس طرح سی آتا ہے یاد
ہجر کے عہدِ زبوں کا گریۂ صبح و مسا

جیسے اکثر نیند میں کروٹ بدلتے وقت جوشؔ!
کان میں آتی ہے ہلکی موجِ باراں کی صدا

(۱۳)

بوندیوں کا سلسلہ ہے، اور ہلکے ابر سے
پڑ رہی ہیں اسطرح سبزے پہ کرنیں گاہ گاہ
وقتِ گریہ جسطرح مکتوبِ غم لکھتے ہوئے
آنسوؤں سے چھن کے آتی ہے سرِ کاغذ نگاہ

---

(۱۴)

ایک ہلکی سی مسرت، ایک مبہم سی خوشی
روح میں کچھ یوں مچلتی ہے بوقتِ پیچ و تاب
جیسے ہلکے ابر میں موہوم سا خطِ ہلال
یا کسی بیمار بچے کا تبسم وقتِ خواب

---

(۱۵)

کیا بتاؤں کہ وہ دمِ گلگشت
کس مزے سے قدم اٹھاتی ہے
جیسے کلیوں پہ رشحۂ شبنم
جیسے آنکھوں میں نیند آتی ہے

---

(۱۶)

صبح کے ہنگام جیسے مدرسے کی گھنٹیاں
طفل کے ذوقِ شکر خوابی کو کرتی ہیں نڈھال
یونہیں لے تاب و تواں بچوں کے مفلس باپ کی
نیند اڑا دیتا ہے ای خوابِ اجل تیرا خیال

(۱۷)

شاد و فرحاں ہیں نئے احباب تیرے لطف سے — سرد مہری سے قدیم احباب کا رُخ زرد ہے
یہ تری سیرت ہے ایسے تیز موٹر کی طرح — جس کے آگے روشنی ہے، اور پیچھے گرد ہے

---

(۱۸)

شب کو اکثر کھوکھلی تاریکیاں میدان کی — روح پر کرتی ہیں طاری اسطرح خوابِ گراں
دل سمجھتا ہے کہ مجھ پر غم سا ہے چھایا ہُوا — جسطرح کُہرے پہ ہو جاتا ہے بارش کا گماں

---

(۱۹)

جھاڑتے ہی جیسے میلا چیتھڑا، اُڑتی ہے گرد — یونہیں، وہ دو شخص جو اک دوسرے سے ہیں خفا
گفتگو کرتے ہیں جب آپس میں از راہِ نفاق — دیکھتا ہوں ان کے ہونٹوں سے غبار اُڑتا ہُوا

---

(۲۰)

جُھٹپٹے کے وقت کوندے کا لپکنا بار بار — ظلمتوں پر مارتا ہے جسطرح تھم تھم کے تیر
یونہیں وحشتناک عصیاں کی اندھیری راتیں — آدمی کے قلب کو رہ رہ کے ڈستا ہے ضمیر

(۲۱)

شب کو سُونے جنگلوں میں جگنوؤں کے رقص سے
کانپ کانپ اُٹھتی ہے کچھ یوں تیرگی بے اختیار
جس طرح مایوس راتوں کی فضائے تنگ میں
نیم جاں اُمید جھپکاتی ہے آنکھیں بار بار

---

(۲۲)

کیا کہوں کس طرح آنکھیں کھولتی ہے نو عروس
مُنہ اندھیرے جیسے نرگس کی کلی بنتی ہے پھول
غنچۂ خاطر کی یا جس طرح کھلتی ہے گرہ
دل پہ یا جس طرح شعرِ کیف پرور کا نزول

---

(۲۳)

خشک ہو کر سایہ بخشی کی نہیں رہتی جب آس
حالتِ اشجار یوں اُس وقت ہوتی ہے سقیم
جیسے آنکھوں میں گدا کی دیکھ کر عزمِ سوال
سر جھکا لیتا ہے فرطِ شرم سے مفلس کریم

---

(۲۴)

غبار اک دوسرے پر پھینکتے ہیں تیز رَو موٹر
مخالف سمت سے ہمدوش ہو کر جب گزرتے ہیں
یونہیں دو بد گہر اشخاص جب ملتے ہیں آپس میں
نئی تاریکیاں اک دوسرے سے اخذ کرتے ہیں

(۲۵)

دشت ہے تاریک اور رہ رہ کے کوندے کی لپک — چھو رہی ہے یوں اُفق کی ظلمتِ خاموش کو
جیسے اُس مایوس کی آنکھوں کا عالم، جو غریب — حال کہنا چاہتا ہو، اور کہہ سکتا نہ ہو

---

(۲۶)

تیرہ جنگل کی گھنی شاخوں کے گہرے سائے میں — بہہ رہی ہے جھٹپٹے کے وقت کچھ اس طرح نہر
جس طرح گیسوئے پیچاں کی درازی کا غرور — قامتِ خوباں میں بن جاتا ہے اک نازک سی لہر

---

(۲۷)

گُندھ ہے پھولوں میں چھپ جاتا ہے جیسے ہار کا ڈورا — یونہیں آنکھوں سے جب دل کی گھٹا برسائی جاتی ہے
تمام اپنی لطافت غرق کر دیتی ہے اشکوں میں — وہ موجِ کیف سینے میں جو غم کے پائی جاتی ہے

---

(۲۸)

شبِ مہ میں جھلک کر سرمئی بادل کے ٹکڑوں سے — جمالِ ماہِ تاباں یوں کلی پر رقص کرتا ہے
ہجومِ ناز و فرطِ شرم کے طوفان میں جیسے — تبسم مدبھری آنکھوں سے ہونٹوں پر اُترتا ہے

(۲۹)

کڑی دھوپ آگ برساتی ہے جب گلزارِ عالم پر — تخیّل ابر کا ہوتا ہے سبزے کے تغیّر میں
یونہیں خوں ریز و خونِ آشام تلواروں کو ہستی کی — مرا دل تولتا ہے تیری رحمت کے تصوّر میں

---

(۳۰)

مل رہے ہیں دونوں وقت اور گر رہا ہے حوض میں — اک کھنک کے ساتھ، فوّارے کا پانی اِس طرح
خامشی سے چھیڑتی ہے، نرم و غمگیں راگنی — شیب کی راتوں میں یادِ نوجوانی جس طرح

---

(۳۱)

شب کو اک پُرسکون محفل کا — آ کے موٹر مِٹا گیا یوں ناز
جس طرح آئے، وقتِ بادہ کشی — کان میں مے فروش کی آواز

---

(۳۲)

جیسے موٹر کی گریزاں روشنی سے راہ میں — نصف لمحے کے لئے ظُلمت پہ چھا جاتا ہے نُور
سرمدی آلام کے مارے ہوئے انسان کو — یونہیں چھُو جاتی ہے دم بھر کے لئے موجِ سُرور

(۳۳)

اِس طرح تیرگی میں ہوتا ہے — خوف کا قلبِ طفل میں آغاز
جس طرح رات کی خموشی میں — سائیکل کی اُتار پر آواز

---

(۳۴)

وقتِ شب کچھ اور بھی تاریک کر جاتا ہے یوں — اپنی چمکائی ہوئی ظلمت کو موٹر کا غُبار
جسطرح کاندھے پہ رکھکر ہات دم بھر کو خوشی — دوش پر غم کا نیا اک اور رکھ جاتی ہے بار

---

(۳۵)

ہوا پُر شور ہے، اور ابرِ بے موسم کی یورش سے — لبِ ساحل شگفتہ چاندنی، مُرجھائی جاتی ہے
یونہی آزردہ انفاسی سینے کی سی حالت — عزیزوں کی شکر رنجی کی تہ میں پائی جاتی ہے

---

(۳۶)

نرم ہو جاتا ہے پلٹس سے جو پک کر پھوڑا — بیشتر نشترِ جرّاح سے ہوتا ہے فگار
فرشِ گُل کی یونہیں ہو جاتی ہے خوگر جو قوم — ہونا پڑتا ہے اُسے خارِ مغیلاں سے دوچار

(۳۷)

پیش اربابِ نظر مشکور ہو سکتی نہیں
یہ تری اظہارِ بے مہری کی سعیِّ متصل
یوں تغافل میں ترے غلطاں ہے موجِ التفات
پردۂ اشعار میں جس طرح سے شاعر کا دل

---

(۳۸)

رات ہے اور چاند حجرے کے
سُرخ شیشوں سے آ رہا ہے نظر
فرطِ گریہ سے چشمِ عاشق میں
جیسے روئے نگار، وقتِ سفر

---

(۳۹)

شام ہوتے ہی یہ کیسا ہو گیا ہے آسماں؟
حاشیے پر روشنی ہے، وسط میں تاریکیاں
کیوں نذرِ ہو کر نہ میں کہہ دوں کہ یہ طرفہ سماں
ہو بہو ایسا ہے، جیسے عصرِ حاضر کے جواں

---

(۴۰)

صبح طالع ہو رہی ہے اور فضائے سرد میں
کھا رہا ہے پیچ و خم، تاریک کہرے کا دُھواں
شہر کی مخلوق، یوں گلیوں میں آتی ہے نظر
خواب میں جس طرح سے دیکھے کوئی پرچھائیاں

(۴۱)

ایک دلکش ملیح چہرے پر صبح کی ہیں ملاحتیں طاری
جیسے نمکیں چیز میں، اے جوشؔ! ایک ہلکی مٹھاس کی دھاری

---

(۴۲)

باغ پر ہیں جھکے ہوئے بادل بُو ہے جھونکوں میں سردپانی کی
کُنج پر چھائی ہے، وہ کیفیت نیند جس طرح نوجوانی کی

---

(۴۳)

تِلملاتی مچھلیوں کی شوخیوں سے جس طرح سطح پر تالاب کی، پڑتے ہیں حلقے باربار
یونہیں دل کی لرزشِ پیہم کے ہاتوں ہرنفس میری چشمِ تر میں رہتی ہے تمنّا بیقرار

---

(۴۴)

بھُولی بھٹکی ہوئی جنگل میں پرندے کی صدا کوئی آوارہ سا جھاڑی میں ہوا کا جھونکا
لُو کے طوفان میں تپتے ہوئے ذرّوں کی لپک کرب کے ساتھ کڑی دُھوپ میں پودوں کی لچک

غنچۂ زرد کا پامال عقیق و یاقوت
گھاس پر دھوپ کی ماری ہوئی تتلی کا سکوت

کرۂ نار سے چیلوں کی لرزتی آواز
بوکھلائے ہوئے بھونروں کی پریشان پرواز

سُرخ ذرات پہ کھائے ہوئے ٹِٹنے کی قسم
رہروِ تشنہ کے مُرجھائے ہوئے نقشِ قدم

یوں ہے ان سب میں تپاں حسرتِ باران و سحاب
آئے پردیس میں جس طرح سے یادِ احباب

(۴۵)

جس طرح گنجانِ باغوں کی ہوا وقتِ غروب
شام کے انفاس سے بنتی ہے آہِ سوگوار

کُنج سے آتی ہے اک طوب بوجھل سی شمیم
منجمد سی بھاپ ہوتی ہے کنارِ جوئبار

سینۂ خنکی پہ ہوتا ہے حرارت کا دباؤ
حسرتِ شبنم میں خوں روتی ہے چشمِ برگ و بار

یونہیں ہو جاتے ہیں جب بچھڑے دن اُنھیں دیکھے ہوئے
روح ہو جاتی ہے بوجھل اور سینہ تنگ و تار

اُٹھنے لگتی ہے برابر ہر بُنِ مو سے اِک آنچ
جس سے آتی ہے تمنّا کی شمیم سوگوار

اور کچھ آنکھوں میں یوں آنسو مچلتے ہیں ندیم
ماہِ تاباں کا ستاروں کو ہو جیسے انتظار

(۴۶)

پھول مٹھی میں اگر کچھ دیر تک رہتے ہیں بند
ہات میں ہوتی ہے پیدا، اک معطّر سی نمی
یونہیں جب کچھ دیر کرتا ہوں تصوّر حسن کا
سانس میں ہوتی ہے خوشبو اور آنکھوں میں تری
اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ جاناں نے مجھے
بھینچ کر آغوش میں تا دیر چھوڑا ہے ابھی

(۴۷)

سنایا مجھے ایک مطرب نے آج
وہ نغمہ، کہ تھا دل میں سویا ہوا
جوانی کی راتوں میں یادش بخیر
جسے چھیڑتا تھا کوئی مہ لقا
کچھ اس طرح نغمے کا ہر زیر و بم
مری سمت آنکھیں اٹھانے لگا
کسی اجنبی شہر میں جس طرح
کوئی بھولا بچھڑا ہوا آشنا
سرِ راہ لوگوں کے انبوہ سے
بڑھے یک بیک مسکراتا ہوا

(٤٨)

شام کا وقت، گاؤں کا میدان — سادہ رُخ، سرد، سرنگوں، سنسان
سلسلے کوہسار کے تا دُور — سامنے صرف اک غنودہ کھجور
جیسے اِک تشنۂ جواب "سوال" — جیسے غربت میں دوستوں کا "خیال"

---

(٤٩)

سر سے نزدیک ہو کے اِک طائر — یوں اُڑا صُبح، نیند جیسے آئے
نصف لمحے کے واسطے، مجھ کو — گیت اِس طرح شہپروں کے سُنائے
ذہن سے جسطرح کہ بات کوئی — یاد آتے ہی محو ہو جائے

---

(٥٠)

جسطرح اے حسنِ خود بیں! نبضِ کاہ و روحِ کوہ — روز و شب اک لرزشِ پیہم سے رہتے ہیں دوچار
کاہ کے دل میں مچلتا ہے بفکرِ رنگ و بُو — تابشِ خورشید و موجِ باد و باراں کا شرار
کوہ میں فرطِ خوشی سے نا تراشیدہ صنم — ڈھونڈتے ہیں بت تراشوں کی نظر دیوانہ وار

یونہیں میرے مضمحل جوہر، مرے افسردہ عزم
تیرے ہلکے سے تبسّم کے لئے ہیں بے قرار



حسن جنبد ز خواب و مژہ برہم زد
فتنہ برپا شد و نشتر بہ رگِ عالم زد

(نظیری)

ل۱ "نسیب" عربی میں اس شاعری کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق کا ذکر ہو۔

عاشق نواز

۱۹۲۳ء

میری پُرسش اور تیری بزمِ ناز — آفریں اے شاہدِ عاشق نواز
میں سراپا خاک، اور میرے لئے — سلسلہ جُنبانیٔ راز و نیاز
اک مرے دل کی تسلّی کے لئے — زلزلے میں آئے اور تمکینِ ناز
تیری طبعِ نازا اور آشفتگی — تیرا پہلو، اور خراشِ جاں گداز
یہ تیرا رُخ اور رنگِ خستگی — یہ ترے لب اور حدیثِ سوز و ساز
تیرا سینہ اور میری آرزو — میری محفل، اور تیری شمعِ ناز
تیرا دل، اور کاہشِ سوزِ نہاں — تیرا سر، اور زانوئے سوز و گداز
آہِ سوزاں، اور تیری لعلِ لب — اشکِ خونیں، اور تیری چشمِ ناز
خارِ حسرت، اور ترا قلبِ رقیق — گردِ حرماں، اور تری زلفِ دراز
تیرا دامن، اور وقفِ اشکِ غم — تیرا سینہ، اور بارِ حرفِ راز

آہ وہ اور اس طرح جھک کر ملے — خود اُٹھاتی ہو جوانی جس کے ناز
جس کے قدموں پر ہو خود فطرت کا سر — وہ پڑھے، اور مجھ سے ملنے کو نماز

اُس کے دل سے پوچھیئے غم کا مزا — "دل شکن" جس کے لئے ہو "دل نواز"

مفت دو جانیں تلف ہونے کو ہیں — سُن رہا ہے اے خدائے بے نیاز؟
مہرباں ہو اے انیسِ بیکساں — رحم فرما اے کریمِ کارساز
ابر میں ہے سنگباری کی گرج
آئینوں کو دیکھ اے آئینہ ساز!

چاند کے انتظار میں تارے

سنہ ۱۹۲۳ء

کس نے وعدہ کیا ہے آنے کا
حُسن دیکھو غریب خانے کا

رُوح کو آئینہ دکھاتے ہیں
در و دیوار مُسکراتے ہیں

آج گھر "گھر" بنا ہے پہلی بار
دل میں ہے خوش سلیقگی بیدار

غرق ہر روح خوش جمالی میں
نظم ہے طبعِ لا اُبالی میں

جمع ساماں ہے عیش و عشرت کا
خوف دل میں فریبِ قسمت کا

سوزِ قلبِ کلیم آنکھوں میں
اشکِ اُمّید و بیم آنکھوں میں

چشم برراہ، شوق کے مارے
چاند کے انتظار میں تارے

رات بھیگی شگفتہ بار رہوا
رنگ کلیوں میں آشکار ہوا

ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں مچلی
ہلکی ہلکی مہک چنبیلی کی

وعدہ، جنجال بن گیا جی کا
رنگِ اُمید ہو چلا پھیکا

اک جہاں چشمِ تر میں گرد ہوا　　دل وہ دھڑکا کہ رنگ زرد ہوا

. . . .

دفعتہً اک چمک سی دوڑ گئی
بام و در پر جھلک سی دوڑ گئی

دل میں چمکی اُمید کی بجلی　　اُنگلیاں اور ہو گئیں ٹھنڈی
الاماں شوقِ دید کی یورش　　بڑھ گئی اور خون کی گردش

اپنی حدِّ وفا ہوئی محسوس
اُن کی آوازِ پا ہوئی محسوس

چھا گئی بام و در پہ رعنائی　　دل میں لی ولولوں نے انگڑائی
جل اُٹھی شمع، دل کے محبس میں　　صبح گویا ہوئی بنارس میں
فرطِ شادی سے بوکھلا سا گیا　　دل میں احساس، شادمانی کا
تار نظروں کے دمبدم کانپے　　لڑکھڑائی زباں، قدم کانپے
نہ رہا سلسلہ وہ آہوں کا　　رشتہ سمٹا مری نگاہوں کا

آئے وہ، اشک تھم گئے بارے
چاند نکلا، ہُسبک ہوئے تارے

جفا ۔ وفا

سنہ ۱۹۲۳ء

دل کی بستی میں کیوں نہو کہرام
آہ یہ نامہ، ہائے یہ پیغام

کاش اسی وقت مجکو موت آجائے
آگ میں پھول کس سے دیکھا جائے

کاش وہ یوں نہ باوفا ہوتی
بانیٔ ظلم ناروا ہوتی

اے وفا کیا کہوں ہیں تیرے طور
تو ہے اک بدترین آلۂ جور

تیرا نخچیر جی نہیں سکتا
ہل کے پانی بھی پی نہیں سکتا

جھینپتی ہے جفا ترے آگے
کانپتی ہے قضا ترے آگے

بول اے نامہ بر جیوں کیسے؟
پھر تو دہرا، یہ کیا کہا اس نے

"آنکھ کھلتے ہی، صبح تیری یاد
دل پہ کرتی ہے جانے کیا بیداد
دل مرا غرقِ یاس رہتا ہے
شام تک جی اداس رہتا ہے"

پھُول

سنہ ۱۹۲۳ء

یہ کس نے جوشؔ کو بھیجے ہیں نازپرور پھُول
شگُفتہ پھُول، جواں پھُول، خُلد پیکر پھُول

ہوائے ناز سے چٹکے ہوئے سُبک غُنچے
شمیمِ زلف سے مہکے ہوئے مُعطّر پھُول

شُعاعِ حُسن سے دہکے ہوئے خُنک شعلے
لبِ نگار کے چُومے ہوئے سخنور پھُول

نسیمِ کاکلِ شب گوں سے پرفشاں گلبرگ
فروغِ نرگسِ شیریں سے خواب آور پھُول

اِرم سے آئی ہوئی حرفِ آرزو کلیاں
خُدائے ناز کے بھیجے ہوئے پیمبر پھُول

پلٹ کے، اے خلشِ نوکِ خار کے شاکی
اُسے بھی دیکھ، جسے ڈس رہے ہیں کافر پھُول

اِسے کیا کہتے ہیں

سنہ ۱۹۲۳ء

جب ادا سے وہ سامنے آئی
ہمنشیں! میں اُسے نہ دیکھ سکا
اور جب آنکھوں سے ہو گئی اوجھل
میں نے جی بھر کے اُس کو دیکھ لیا

کچھ کہا اُس نے، اور میں سُن نہ سکا
اور جب وہ چلی گئی کہہ کے
میرے کانوں نے سُن لیا وہ بھی
جو کہا بھی نہ تھا ہنوز اُس نے

تجاہلِ عارفانہ

۱۹۲۳ء

کیوں صبح یوں عرق میں نہائے ہوئے ہو تم؟
شاید کسی خلش کے جگائے ہوئے ہو تم

اُلجھا ہوا ہے کرب سے ہر رشتۂ نفس
گو دیکھنے میں زُلف بنائے ہوئے ہو تم

جن مشغلوں سے کھیلتی رہتی تھی کم سنی
اُن مشغلوں سے ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہو تم

شاید یہ اہتمام ہو اخفائے راز کا
ہمجولیوں سے آنکھ چُرائے ہوئے ہو تم

خود کو لیئے دیئے ہو مگر کہہ رہے ہیں طور
سینے میں ایک حشر چھپائے ہوئے ہو تم

کیا جوشِ نامُراد کو دیکھا ہے خواب میں؟
یوں صُبح کو جو شام بنائے ہوئے ہو تم

پہلی مفارقت

سنہ ۱۹۲۳ء

چاند سے عہدِ وصل کی باتیں
ہائے فرقت کی چاندنی راتیں

آفتیں جمع ہیں جُدائی کی
چاندنی رات ہے جُدائی کی

کوئی کافر ہی شب کو سوتا ہے
رات بھر دل میں درد ہوتا ہے

اُٹھتی رہتی ہیں بار بار آنکھیں
ڈھونڈتی ہیں جمالِ یار آنکھیں

کچھ وہ تکیوں سے آتی ہے خوشبو
نیند آتی نہیں کسی پہلو

چھیڑتا ہے جو کوئی رات کو ساز
صاف آتی ہے یار کی آواز

آگ سی پہلوؤں میں جلتی ہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جو چلتی ہے

مُرغ جب صُبح کو جگاتے ہیں
چونکتے ہی وہ یاد آتے ہیں

شغلِ مرگ و حیات کی راتیں
ہائے وہ التفات کی راتیں

بے نتیجہ ہے صبر کی تلقین
بلکہ دیتا ہے جب کوئی تسکین

شعلۂ غم بھڑکنے لگتا ہے
اور بھی دل دھڑکنے لگتا ہے

ہر نفس آہ، ہر سخن نالہ — سَم ہے آب و ہوائے بنگالہ [1]

اے اودھ کی نسیمِ عقدہ کشا — وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
بادلوں کی طرح برستی ہیں — آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں

اُٹھتی رہتی ہے ہُوک سی پیہم — ہائے وہ رُخ، وہ کاکلِ برہم
ہائے وہ چاندنی، وہ مہتابی — مست آنکھوں کی وہ شکر خوابی
برگِ گُل پردہ ماہتاب کی ضَو — رُخ پہ وہ آمدِ شباب کی رَو
خال و خد سے عیاں بصد انوار — صُبحِ صادق کی چاندنی کا نکھار

ہاں تو اے دل نشیں اودھ کی صبا — وہ ملیں تو پیام یہ کہنا
بادلوں کی طرح برستی ہیں — آنکھیں دیدار کو ترستی ہیں

ایک مدت ہوئی نہیں دیکھا — ہائے تیرا وہ چاند سا مکھڑا
اس طرح صبح و شام ہوتی ہے — دل دھڑکتا ہے، آنکھ روتی ہے
کھائے جاتا ہے کوئی سینے کو — آگ لگ جائے ایسے جینے کو

تنگ ہے سانس آنے جانے سے
اب بُلا لے کسی بہانے سے

[1] یہ نظم کلکتے میں کہی گئی تھی

زرد پتیاں

سنہ ۱۹۲۳ء

بھیجی ہیں کسی نے بہرِ درماں — بیلے کی چمن فروز کلیاں
ڈوبی ہوئی عطرِ کم سنی میں — دونے کی مہین کوری سینکیں
کلیوں سے مگر عیاں ہے زردی — یہ روحِ غم ان میں کس نے بھر دی؟
گویا ہیں زبانِ حال سے یوں — اے شاعرِ خوش نصیب و محزوں
بھیجا ہے چھپا کے ہم کو جس نے — جانے اسے غم دیے ہیں کس نے
یوں زرد وہ روئے دلنشیں ہے — اک چھینٹ بھی خون کی نہیں ہے
ہم سے یہ کہا ہے جا کے کہنا — لازم نہیں اب خموش رہنا
مجھکو تری یاد نے ڈبویا — مرجھائی ہوئی کلی ہوں گویا
بھرتی ہوں چھپا کے شب کو آہیں — ہٹتی نہیں چاند سے نگاہیں
شاما جو سحر کو بولتی ہے — آنکھوں کی گرہ کو کھولتی ہے
لب خشک ہیں، منہ ہے اترا اترا — پنڈا کب سے ہے پھیکا پھیکا

چہرے سے عیاں ہے دل کی الجھن
ڈھیلے ہیں کلائیوں کے کنگن

اللہ یہ کیا ہوا ہے مجکو
دیکھو جسے دیکھتا ہے مجکو

اب حد سے سوا ہے خستہ حالی
نزدیک ہے وقتِ پائمالی

آنا ہو تو آکہ دل ہے بیتاب
ایسے میں ابھی چمن ہے شاداب

جلد آکہ فروغِ رنگ و بُو ہو
قبل اس کے کہ خُونِ آرزو ہو

عُقدۂ لاینحَل

سنہ ۱۹۲۴ء

(۱)

درسِ عبرت ہے یا اولی الابصار
میرا افسانۂ دلِ بیمار

یہ فسانہ نہیں، حقیقت ہے
"شاعری سے نہیں مجھے سروکار"

دل میں ہیں جذبہائے گوناگوں
اُلجھی جاتی ہے کاکلِ گفتار

کم پڑی ہوگی نوعِ انساں پر
جس مصیبت سے آج میں ہوں دوچار

(۲)

اُس طرف حُسن، خودسر و خودبیں
اِس طرف عشق، ضابط و خوددار

اُس طرف نازو دلبری کا شکوہ
اِس طرف شعر و بیخودی کا وقار

اُس طرف حسن، غرقِ صد نخوت
اِس طرف عشق، محوِ صد پندار

اُس طرف شوخیوں میں بھی تمکین
اِس طرف اضطراب میں بھی قرار

اُس طرف بے رخی ہی درماں ہے
اِس طرف ہے پرستشِ آزار

اُس طرف چارہ گر ہے بے پروا — اِس طرف بے نیاز ہی بیمار
اُس طرف اعتبارِ عشوہ و ناز — اِس طرف اعتمادِ صبر و قرار
اُس طرف کیفِ نرگسِ مخمور — اِس طرف دورِ بادۂ اشعار
اُس طرف عہد ہے نہ سُننے کا — اِس طرف بند ہیں لبِ گُفتار
کہنے جاؤں تو وہ سُنیں رُوداد — سُننے آئیں تو میں کروں اظہار
مجکو یہ کد، وہ ہوں تبسّم ریز — اُن کو یہ ضد کہ یہ کرے اصرار

(۳)

یہ روِش ترک بھی اگر کر دوں — ایک عُقدہ ہے اور بھی دُشوار
فرض کیجیے اُسے بھی سُلجھادوں — گُتھیاں اور بھی تو ہیں دو چار
مُدعا ہے غرض وہ پیچیدہ — کہ دُعا مانگنا بھی ہے دُشوار

(۴)

مجکو وصل و فراق، دونوں رسَن — مجکو تریاق و زہر، دونوں دار
عہدِ اِخلاص توڑنے میں بھی ننگ — رشتۂ شوق جوڑنے میں بھی عار
اُن کا آنا، بلائے ہوش و خرد — اُن کا جانا، وداعِ صبر و قرار
اُن سے ملیئے تو عافیت برباد — اُن سے کھنچیے تو زندگی بیکار

اُن کی وابستگی بھی سوزِ جحیم | اُن کی بیگانگی بھی شعلۂ نار
اُن کا پردا بھی موجبِ ایذا | اُن کا جلوہ بھی باعثِ آزار
اُن کی دُوری بھی خنجرِ خوں ریز | اُن کی قربت بھی دشنۂ خونخوار
اُن کے کھونے پہ بھی نہیں راضی | اُن کے پانے پہ بھی نہیں تیّار
کون سمجھے گا اِن معمّوں کو | عشق ہی مست عشق ہی ہشیار
عشق ہی ہجر کے لیے بیچین | عشق ہی وصل کے لئے بیمار
عشق ہی قدر دانِ جلوۂ نوُر | عشق ہی مدح خوانِ گوشۂ تار
عشق ہی راہِ سعی میں خفتہ | عشق ہی بزمِ فکر میں بیدار
کس قدر ہیں عمیق یہ باتیں | کس قدر ہے عجیب یہ گفتار
کون سمجھے گا اِن معمّوں کو | دُور ہیں آہ محرمِ اسرار

(۵)

اِس طرف تو یہ کشمکش دل میں | اور اُدھر ہے یہ رنگِ لیل و نہار
اک طرف زاہدوں کی مجلس ہیں | میری غیبت کا گرم ہے بازار
اِک طرف عاقلوں کی محفل سے | سخنِ ناروا کی ہے بوچھار
قابلِ مضحکہ مرے انداز | درخورِ سرزنش مرے اطوار

گوش، پامالِ طعنۂ احباب | چشم، مجروحِ خندۂ اغیار
راہزن جمع، راہبر ناپید | رات تاریک، راہ ناہموار
آنکھ نمناک، راستے خس پوش | نور خوابیدہ، ظلمتیں بیدار
جلوے معدوم، از مژے مفقود | چشم خوننابہ ریز، گوش فگار
وضعِ اہلِ وطن معاذ اللہ | تہمتوں کے لگا دیے انبار
غربت افسردگی، وطن کلفت | غیر بےحس، عزیز ناہنجار
کس سے جا کر کہے کوئی احوال | کس سے جا کر کرے کوئی اظہار
اہلِ ظاہر، مجھے خس و خاشاک | اہلِ باطن، مجھے در و دیوار
بند ہے مجھ پہ فیضِ دیر و حرم | تنگ ہیں مجھ سے کافر و دیندار
سخت ہیں مجھ پہ کفر کے آئین | تیز ہے مجھ پہ شرع کی تلوار
اک طرف موت، ایک جانب زیست | وہ بہت سہل، یہ بہت دشوار

ہر سخن آگ، ہر نفس بجلی
”وقنا ربنا عذاب النار“

نگارِ رفتہ

سنہ ۱۹۲۴ء

نگارِ رفتہ کو یارب! وطن میں پہنچا دے
دوبارہ دُرِّ عدن کو عدن میں پہنچا دے

حرم کی شمع کو طاقِ حرم میں روشن کر
چمن کی جان کو صحنِ چمن میں پہنچا دے

وطن کی روح کو جسمِ وطن میں واپس کر
غزالِ دشتِ خُتن کو خُتن میں پہنچا دے

سمن سے پھر سمنستان کو شادماں فرما
گہر کو پھر صدفِ پُرمحن میں پہنچا دے

صبا کو گلکدۂ آرزو میں رقصاں کر
صنم کو بُتکدۂ برہمن میں پہنچا دے

وہ اپنے حُسن سے محفل ہیں اپنے عشق سے بزم
اُس انجمن کو پھر اِس انجمن میں پہنچا دے

سکوتِ جوشؔ کو دے رُخصتِ ترانۂ شکر
سخن کو حلقۂ شاہِ سخن میں پہنچا دے

عشقِ کامراں

سنہ ۱۹۲۴ء

تعالی اللہ کہ وہ دلدارِ شیریں ہوا ہے پھر انیسِ جانِ غمگیں
مبارک اے دلِ حیراں مبارک کہ پھر جاری ہوئے آئینِ پیشیں
ترانے چھیڑ اے بلبل طرب کے کہ زیرِ سنگ ہی دامانِ گلچیں
خوشا طالع کہ میرے بازوؤں پر مچلتی ہے وہ زلفِ عطر آگیں
حدیثِ لطف سے گرما رہی ہیں مرے سینے کو وہ لبہائے رنگیں
بحمد اللہ وہ خود مائل ہوا ہے برغمِ بندگانِ رسم و آئیں

محبت کامران و شادماں ہے
بھلا دو قصۂ فرہاد و شیریں

شادی و مرگ

سنہ ۱۹۲۴ء

کدھر ہے اے موت؟ آ، کہ غم سے لبوں پہ اب جان آ رہی ہے
وہ شمع، جو یادگارِ شب تھی، اُسے بھی آندھی بجھا رہی ہے

دُہائی حُسنِ خجستہ خُو کی، کہ رسمِ عالم کی فتنہ خیزی
بچھڑے ہُوؤں کو مِلا رہی ہے، مِلے ہُوؤں کو چھُڑا رہی ہے

اُدھر نفیری کی مست لہریں لئے ہوئے ہیں پیامِ شادی
اِدھر نسیمِ سحر کی جنبش ترانۂ غم سُنا رہی ہے

اُدھر عروسی لباس زر میں دمک رہا ہے کسی کا مکھڑا
اِدھر کسی کی خوشی کو دُنیا سیاہ کفنی پہنا رہی ہے

قدیم پیغامبر تھی میری، صبا کو یہ آج کیا ہوا ہے؟
اِدھر بُجھاتی چلی ہے شمعیں، اُدھر شگوفے کھلا رہی ہے

اِدھر کلیجے میں تھرتھراتا ہے شعلۂ مرگِ ناگہانی

اُدھر شبستانِ رنگ و بُو میں حیاتِ نو مُسکرا رہی ہے
اِدھر عرق ہے مری جبیں پر، اُدھر جھلکتی ہے جوشِ افشاں
اِدھر لبوں پر ہیں سرد آہیں، اُدھر صبا گنگنا رہی ہے

تیرے لئے

سنہ ۱۹۲۵ء

دیکھ کیونکر جی رہا ہوں دلربا تیرے لیے
ہر نفس ہے اک حدیثِ کربلا تیرے لیے

ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں
پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لیے

میں کہ آغوشِ سکوں میں پا چلا تھا آپ کو
پھر محیطِ کشمکش میں کھو گیا تیرے لیے

حسرتیں دل کی رواں ہیں کارواں در کارواں
ہر نفس ہے ہجر میں بانگِ درا تیرے لیے

آہ گو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابنِ رئیس
بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لیے

مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے قرب کی
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لیے

شرع سے درخواست کرتا ہوں کشودِ کار کی
کھٹکھٹاتا ہوں درِ دار القضا تیرے لیے

آہ اک فتوے کی خاطر کہنا پڑتا ہے مجھے
"شیخ" سے نا اہل کو "مردِ خدا" تیرے لیے

جاہلانِ بے خرد کے ناسزا اقوال کو
ماننا پڑتا ہے بے چون و چرا تیرے لیے

چاک کر کے میں نے آبائی امارت کا لباس
زیبِ تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لیے

مشتری جس کا خدا تھا، چند سکوں کے عوض
بیچ دی میں نے وہ جنسِ بے بہا تیرے لیے

پھیر لیں آنکھیں مناظر سے ملیح آباد کے
لکھنؤ کی چھوڑ دی آب و ہوا تیرے لیے

کر چکا ہوں شدتِ حرماں سے تنگ آ کر معاف
ہر فرو مایہ کو اپنا خوں بہا تیرے لیے

پوجنا پڑتا ہے ہر کافر کو تیرے واسطے
ماننا پڑتا ہے ہر بُت کو خُدا تیرے لیے

آہ جو فرشِ حرم پر بھی کبھی جھکتا نہ تھا
میں نے بُتخانے میں وہ سر رکھ دیا تیرے لیے

شرط پوری ہو چکی، للہ اب تو رحم کر
دیکھ کیا تھا جوشؔ، اور کیا ہو گیا تیرے لیے

خواب کی پرچھائیں

سنہ ۱۹۲۵ء

سناٹا پچھلی رات کا ہے مخلوقِ خدا کی خواب میں ہے
تاروں کی نگاہیں نیچی ہیں ہلکی سی چمک مہتاب میں ہے

اطراف میں روشندانوں کے کچھ نور سا دھیما دھیما ہے
دیواروں کے نیچے گلیوں میں مُبہم ہول اندھیرا چھایا ہے

پتوں کو سمیٹے خواب میں ہیں دو ڈری ہوئی بلبلیں کا خوں ہے
بول اُٹھتا ہے بے ہنگام کبھی اک آدھ پرندہ شاخوں پر

اللہ یہ کیسی بے چینی اس وقت دلِ بیتاب میں ہے؟
یہ عکس ہے کس کا ذروں پر، کس کی یہ جھلک مہتاب میں ہے

فردوس کی شمعیں روشن ہیں یا کس چراغِ طور ہے یہ؟
گھر بھر میں یہ کس کا پرتو ہے، ہر چیز پہ کیسا نور ہے یہ؟

حلقے میں گھرا ہوں جلووں کے ہستی کا نہیں کچھ ہوش مجھے
اس وقت یقیناً خواب میں کوئی دیکھ رہا ہے جوش مجھے

غربت میں ہے شانِ صبحِ وطن، ہر چیز پہ یہ رعنائی ہے
پردیس میں اپنے مجنوں کی تسکین کو لیلیٰ آئی ہے

طوفان سا جوئے شیر میں ہے حسن آیا ہے کشتی کھینے کو
بیتاب ہے شیریں بازو پر فرہاد کے بوسہ دینے کو

اک رنگ سا چہرے پہ رقصاں ہے، اک نور سا دل پر چھایا ہے
اُن ہونٹوں پہ شاید سوتے میں ہلکا سا تبسم آیا ہے

جفائے التفات

سنہ ۱۹۲۵ء

کیا وہ بتائے کیا کیا عشوہ روزگار نے
مارا ہو جس غریب کو حسنِ وفا شعار نے

اب وہ شہیدِ التفات دل کی گرہ کسے دکھائے
بند کیا درِ طرب جس پہ کشودِ کار نے

سمجھے گا کون نکتہ رس اس کی حدیثِ خونچکاں
جس کا لہو بہا دیا تیغِ وفائے یار نے

کون یقین لائے گا کس سے کہوں یہ ماجرا
لوٹ لیا مرا چمن عربدۂ بہار نے

مصحفِ انبساط نے آیۂ حزن پیش کی
فتح سے دور کر دیا نصرتِ کردگار نے

مجکو درِ نشاط نے اشکِ الم عطا کیے
شامِ شکست نذر کی صبحِ ظفر شکار نے

حسن کے جذبِ عشق نے دل کو تباہ کر دیا
پھول کی روح کھینچ لی شبنمِ اشکبار نے

بھیس میں آ کے عشق کے جوش تجھے مٹاؤ گا
مجھ سے قسم یہ کھائی تھی حسنِ ستم شعار نے

آرزوئے محروم

۱۹۲۶ء

فریاد ہے اے خلوتیِ پردۂ ناموس
کب سے ہوں تری دُھن میں گریباں دریدہ

واقف ہی کہ کس طرح سرِ بالش و بستر؟
راتوں کو تڑپتا ہے ترا زُلف گزیدہ؟

دم بھر کے لیے تو کبھی آغوش میں آجا
اے عُمرِ رواں! سایۂ آہوئے رمیدہ!!

ممکن ہو تو اب خاکِ مذلت سے اُٹھا لے
میں کب سے پڑا ہوں صفتِ اشکِ چکیدہ

وہ سجدہ کروں، سر ہی نہیں، رُوح بھی جھک جائے
دے اِذن اگر جنبشِ ابروئے خمیدہ

قسمت کی طرح دستِ طلب بھی تو ہی کوتاہ
افسوس ہے اے میوۂ شادابِ رسیدہ!

وحشی کا کسی رُت میں بھی جی خوش نہیں ہوتا
فریاد ہے اے افسرِ گلہائے دمیدہ!

سونے کو ترستی ہیں برستی ہوئی آنکھیں
بیدار ہو اے ترکِ محبت بخشیدہ

ظالم! ترے دیوانۂ محروم کے سر پر
ہر آن حریفوں کی کمانیں ہیں کشیدہ

آتا ہوں ترے شہر میں پامالِ ملامت
جاتا ہوں تری راہ سے دشنام شنیدہ

"در کوئے تو معروفم و از روئے تو محروم
گرگِ دہن آلودہ و یوسف ندریدہ" (سعدی)

ناقابلِ تسخیر

سنہ ۱۹۲۶ء

ہمنشیں! ترکِ وفا پر اُسے توبیخ نہ کر
قید ہوتی ہے کہیں بوئے چمن، موجِ گہر؟

جلوۂ شبنم و نورِ سحر و بانگِ طیور
اِن کی تسخیر کا دُنیا میں ہے کس کو مقدور؟

ہمنشیں! ترکِ وفا پر اُسے توبیخ نہ کر
وہ بھی تھی بوئے چمن، خندۂ گل، موجِ گہر

کس لیے خاک میں ملتا نہ ہر آنسو میرا
ہمنشیں! اُس کے لئے تنگ تھا پہلو میرا

سوچ اِس دل کو مرے جس نے اُسے رام کیا
اُس نے دو دن بھی جو چاہا تو بڑا کام کیا

کون لے گیا؟

سنہ ۱۹۲۶ء

اے یارِ دلنشیں! وہ ادا کون لے گیا؟
تیرے نگیں سے نقشِ وفا کون لے گیا؟

حل کر دیا تھا جس نے معمّا شباب کا
تجھ سے وہ فکرِ عقدہ کُشا کون لے گیا؟

تھا لُطف پہلے قہر میں، اب صرف قہر ہے
ظُلمت سے موجِ آبِ بقا کون لے گیا؟

کیوں دفعتہً لبوں پہ خموشی سی چھا گئی؟
اِس سازِ دلنشیں کی صدا کون لے گیا؟

آنکھوں سے شانِ بذل و سخا کس نے چھین لی؟
سینے سے ذوقِ لطف و عطا کون لے گیا؟

تھیں جس کی رَو سے خونِ تمنا میں سُرخیاں
رخسار سے وہ رنگِ وفا کون لے گیا؟

راتوں کو مانگتا تھا دُعا میری دید کی
وہ منّتیں، وہ ذوقِ دعا کون لے گیا؟

اے شاہِ بندہ پرور و سُلطانِ نرم دل!
دل سے ترے خیالِ گدا کون لے گیا؟

پہلی سی وہ کلام میں نرمی نہیں رہی
گفتار سے مزاجِ صبا کون لے گیا؟

اب جوشؔ کے لیے ہیں نہ آنسو، نہ آہِ سرد
اِس گلستاں کی آب و ہوا کون لے گیا؟

آتے نہیں ہو تم

۱۹۲۶ء

محرابِ جاں میں شمع جلاتے نہیں ہو تم
اب مسکرا کے سامنے آتے نہیں ہو تم

ظاہر میں تو حجاب ہو، در پردہ سامنا
پردا اب اُس ادا سے گراتے نہیں ہو تم

پہلے مری نظر تھی اور ارزانیٔ جمال
اب خواب میں بھی شکل دکھاتے نہیں ہو تم

جس کا ہر ایک حرف تھا اِک دفترِ نشاط
وہ بات اب زبان پہ لاتے نہیں ہو تم

آنکھوں میں اشک، رُخ پہ تمنا، لبوں پہ آہ
اب اِس ادا سے سامنے آتے نہیں ہو تم

میرے پیامبر کے اُٹھاتے تھے پہلے ناز
اب میرے دل کے ناز اٹھاتے نہیں ہو تم

آتی ہیں حسبِ قاعدہ راتیں اُسی طرح
لیکن نظر بچا کے اب آتے نہیں ہو تم

یک لخت تم نے جوشؔ کو دل سے بُھلا دیا
اور اِس میں بھید کیا ہے؟ بتاتے نہیں ہو تم

آن باقی ہے

۱۹۳۶ء

ہنوز عشق و محبت کی شان باقی ہے
وُہی زمین، وُہی آسمان باقی ہے

جبیں یہ گو شکنِ عقل ہے زمانے سے
مگر نظر میں جنوں کا نشان باقی ہے

ربابِ فصلِ بہاری خموش ہے کب سے
ہنوز مطربِ وحشت کی تان باقی ہے

وہاں جفا ہی جفا رہ گئی ہے مدت سے
یہاں جفا پہ وفا کا گمان باقی ہے

جفا کا اب نہیں اگلا سا بانکپن قائم
مگر وفا کی وُہی آن بان باقی ہے

وہ جوش، چھوڑ چکے ناوک افگنی پھر بھی
چمکتا تیر، لچکتی کمان باقی ہے

اُداس صبح

سنہ ۱۹۲۶ء

خواب میں دیکھ کر رُخِ زیبا آنکھ میری کھُلی تو کیا دیکھا

گھر ہے تاریک، تنگ، سرد، خموش دل دھڑکتا ہوا، اُڑے ہوئے ہوش

تیغ سی فرش کی ہر ایک شکن لب پہ خشکی، دماغ میں اُلجھن

لے رہی ہے عجب طرح لہریں ایک نرم آنچ سی کلیجے میں

ہل گیا دل، کلیجہ یُوں دھڑکا
اِسی ہلچل میں ہو گیا تڑکا

مُرغ بولے، فضا پہ جھلکا نُور صحنِ گلشن میں چہچہائے طیُور

یوں صدائیں ہواؤں پر پھیلیں
میں نے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں

خبر ہے کہ نہیں؟

سنہ ۱۹۲۶ء

اے صبا! کوچۂ جاناں میں گزر ہے کہ نہیں؟
تجھکو اُس فتنۂ عالم کی خبر ہے کہ نہیں؟

بجھ گیا دہر کا فانوس کہ روشن ہے ابھی؟
اب اُن آنکھوں میں لگاوٹ کا اثر ہے کہ نہیں؟

اب مرے نام کا پڑھتا ہے وظیفہ کوئی؟
اب مرا ذکرِ وفا وردِ سحر ہے کہ نہیں؟

اب بھی تکتی ہیں مری راہ وہ کافر آنکھیں؟
اب بھی دُزدیدہ نظر جانبِ در ہے کہ نہیں؟

چھپ کے راتوں کو مری یاد میں روتا ہے کوئی؟
موجزن آنکھ میں اب خونِ جگر ہے کہ نہیں؟

حسن کو پُرسشِ بیمار کا ہے اب بھی خیال؟
مہر کی ذرۂ خاکی پہ نظر ہے کہ نہیں؟

بے خبر مجکو زمانے سے کیا ہے جس نے
کچھ اُسے میری تباہی کی خبر ہے کہ نہیں؟

کھائے جاتا ہے مجھے دردِ غریب الوطنی
دل پہ اُس جانِ وطن کے بھی اثر ہے کہ نہیں؟

جوش خاموش بھی ہو پُوچھ رہا ہے کیا کیا
کچھ تجھے تاڑنے والوں کی خبر ہے کہ نہیں؟

تیرا عہدِ تمنّا

۱۹۲۷ء

دل نے بخشا تھا تقاضائے زلیخا تجھکو
یاد ہے وہ خلشِ عہدِ تمنّا تجھکو؟

چونکتے ہی ترے دل سے وہ دھواں اُٹھتا تھا
شبِ تاریک تھا ہر نور کا تڑکا تجھکو

نرگسِ ناز میں یوں اشک بھرے رہتے تھے
نظر آتا تھا ورق دہر کا دھندلا تجھکو

الاماں عشق میں اُلجھی ہوئی نیچی نظریں!
دل سا ملتا تھا ہر اک شے میں دھڑکتا تجھکو

روزِ باراں میں ستاتا تھا غمِ عشق تجھے
شبِ مہتاب میں ڈستی تھی تمنّا تجھکو

ہر گھڑی میری حضوری کی تمنا تھی تجھے
ہر نفس میری جُدائی کا تھا دھڑکا تجھکو

ہائے کیا دن تھے کہ آئینے کے آگے ہر صبح
چاند سا منہ نظر آتا تھا جب اُترا تجھکو

حضرتِ خضر جہاں راہ بھٹک جاتے ہیں
عشق نے لاکے وہاں چھوڑ دیا تھا تجھکو

جب ہوا ابر کے سائے میں سنک جاتی تھی
چھیڑ دیتا تھا محبت کا تقاضا تجھکو

چاندنی صحن میں جس وقت چھٹک جاتی تھی
پھونک دیتا تھا مرے عشق کا شعلا تجھکو

راستے سے کوئی آواز جب آجاتی تھی
میری آواز کا ہو جاتا تھا دھوکا تجھکو

قہر ڈھاتا تھا مرا درسِ تحمّل تجھ پر — زہر لگتا تھا مرا وعدۂ فردا تجھکو

کیا قیامت تھی کہ اِس گل بدنی کے باوصف — روز کانٹوں پہ لُٹاتی تھی تمنّا تجھکو

میں کسی بات پہ دم بھر کے لئے غور کروں — اِتنی فرقت بھی نہ ہوتی تھی گوارا تجھکو

جوشؔ سے پوچھ کہ اب تک ہے اُسے یاد دو دو
کہ کبھی مہر و وفا کا بھی تھا دعوا تجھکو

اِلتجائے کرم

سنہ ۱۹۲۸ء

آ ناز سے پھر، اور انیسِ دل و جاں ہو
اے خونِ طرب! عشق کی نبضوں میں رواں ہو

اللہ ری ظلمت کہ سجھائی نہیں دیتا
اے شمع! خُدا کے لیے پھر شعلہ فشاں ہو

اے ماہِ شبِ چاردہم، پھول کھلا دے
اے موجِ نسیمِ سحری! عطر فشاں ہو

مُرجھا کے نہ رہ جائے کہیں کشتِ تمنّا
اے ابرِ اَجل، اے رُخِ خورشید! نہاں ہو

راتیں مجھے کانٹوں پہ بدلواتی ہیں پہلو
اے صبح! علم کھول دے، اے نُور عیاں ہو

اے صبح! کبھی رات کے پہلو میں بھی آ جا
اے شاہ! گدا کا بھی کبھی مونسِ جاں ہو

اے بادہ! کبھی جامِ سفالیں میں بھی کر ناز
اے عرش کبھی فرش پہ بھی نُور فشاں ہو

اے دیدۂ مے پرور و اے نرگسِ مخمور!
دم بھر کے لئے میری طرف بھی نگراں ہو

اے غُنچہ لبی! حرف و حکایت کے کِھلا پھول
اے کم سخنی! چشمۂ تقریر و بیاں ہو

اُٹھا دے چراغ آ کے مرے خانۂ دل کا
قبل اس کے کہ شعلے کی جگہ صرف دُھواں ہو

تو ہاتھ جو آ جائے تو پھر جوش کے نزدیک
اک جَو کے برابر بھی نہ جنسِ دو جہاں ہو

دو خواب

سنہ ۱۹۲۹ء

شب کہ واں سازِ طرب آسودۂ مضراب تھا
گوشۂ خلوت مرا اک دیدۂ پُر آب تھا

کُنجِ تنہائی میں تھا یاں صرف اک ناکام دل
مسندِ شادی پہ واں انبوہِ شیخ و شاب تھا

یاں اسیرِ یاس پر چھائی ہوئی تھی مُردنی
واں عروسِ نو کا چہرہ غرقِ آب و تاب تھا

خاک پر یاں سر تھا، اور آنکھوں میں اشکِ لالہ رنگ
فرش پر واں پھول تھے، اور چرخ پر مہتاب تھا

یاں بساطِ تشنگی پر تھیں بلا کی کروٹیں
واں حریمِ عیش میں دورِ شرابِ ناب تھا

تھی اُدھر تقدیر سے بادِ مُراد و موجِ نرم
اِس طرف ٹوٹی ہوئی کشتی تھی اور سیلاب تھا

اُن کی چشمِ ناز میں تھا واں شکر خوابی کا رنگ
میری آنکھوں کو اِدھر فرمانِ ترکِ خواب تھا

آ رہا تھا موج در موج اُس طرف ابرِ بہار
بحرِ غم میں اس طرف گرداب پر گرداب تھا

نامرادی کا تصوّر بھی نہ تھا واں باریاب
کامرانی کا تخیّل بھی یہاں نایاب تھا

ناگہاں آلام کی شدّت سے چکرانے لگا
سر کہ خلدِ زانوئے جاناں سے لذّت یاب تھا

کس سے کہئے التفاتِ یار کی دریا دلی
ذرّہ ذرّہ بوستانِ شوق کا شاداب تھا

قصّہ رنگینِ عہدِ سجدہ ریزی کیا کہوں
سامنے اُن ابرووں کا گوشۂ محراب تھا

عشق بازی کا غرورِ کامرانی، الاماں
میری حسرت میں خود اُسکا حسن جب بیتاب تھا

کاوشِ ذوقِ نظر بازی کی راتیں ہائے ہائے
دیدۂ مخمور جب میرے لئے بیخواب تھا

لعلِ گوہر ریز کی ہر آہ تھی موجِ نسیم
نرگسِ رنگیں کا ہر آنسو دُرِ خوش آب تھا

اور اب یہ بیدلی ہے انقلابِ دہر سے
جیسے بحرِ لطفِ ازل کے دن ہی سے پایاب تھا

تھا یہی عالم کہ آئی بامِ گردوں سے صدا
یہ بھی اک دن خواب ہو جائے گا، وہ بھی خواب تھا!

یہ بھی نہ سہی

سنہ ۱۹۲۹ء

تیرے قربان، ارے خواب میں آنے والے
داستاں عہدِ تمنّا کی سُنانے والے

ہاں ترے حرفِ شکایت سے پشیمان ہوں میں
بخش دے، بہرِ خُدا، جرم کہ انساں ہوں میں

یہ مگر وہم ہے اے پیکرِ حسن و تنویر
کہ یہ دل اب ہے کسی اور کی زُلفوں کا اسیر

ہاں ترے ہجر میں اک شغل نکالا ہے ضرور
شدّتِ کاہشِ آلام کو ٹالا ہے ضرور

قاعدہ ہے، نہیں ہوتا ہے فلک پر جب ماہ
لطف اُٹھاتی ہے چمکتے ہوئے تاروں سے نگاہ

بِن ترے جب کسی کل چین نہیں پاتا ہوں
میں بھی یوں ہی دلِ افسردہ کو بہلاتا ہوں

تو ہے آزردہ، تو جھوٹی بھی تسلّی نہ سہی
رشک آتا ہے اگر تجکو تو یہ بھی نہ سہی

التجائے مرگ[1]

۱۹۲۹ء

کر قطع نخلِ عمر، گلستاں کا واسطہ
یا ربّ بہارِ عالمِ امکاں کا واسطہ

اب نشّۂ حیات سے دے جوش کو فراغ
تجھکو خمارِ نرگسِ جاناں کا واسطہ

اب آفتابِ عمر کو دے رخصتِ غروب
تجھکو طلوعِ صبحِ بہاراں کا واسطہ

کام و دہن کو موت کی تلخی سے کر دوچار
شکر فشانیٔ لبِ خوباں کا واسطہ

اب طولِ زندگی سے مجھے کر نہ شرمسار
بالیدگیٔ زلفِ پریشاں کا واسطہ

ساقی پلا اجل کی ابلتی ہوئی شراب
عمرِ مسیح و چشمۂ حیواں کا واسطہ

اب چشمِ تر سے چھین بھی لے نورِ زندگی
اہلِ نظر کے دیدۂ حیراں کا واسطہ

آنسو مری حیات کا ٹپکا دے خاک پر
یا ربّ نزولِ قطرۂ نیساں کا واسطہ

دے روزِ تلخِ زیست کو اب حکمِ اختصار
تجھکو درازیٔ شبِ ہجراں کا واسطہ

زِہ قامتِ حیات پہ کر اب کمانِ مرگ
تجھکو سہی قدانِ گلستاں کا واسطہ

(۱) کسی کی نصیب دشمناں خطرناک ناسازیٔ مزاج کے موقع پر یہ نظم کہی گئی تھی۔

جھلکا مری جبیں پہ عرق کربِ نزع کا — رنگیں رُخوں کی تابشِ افشاں کا واسطہ

اب مکرِ زندگی سے فراغت کی دے نوید — شیریں لبوں کی سُستیِ پیماں کا واسطہ

اب جلد چاک کر مرے رختِ حیات کو — چاکِ قمیصِ یوسفِ کنعاں کا واسطہ

چُٹکی سے چھوڑ ناوکِ ہستی شکار کو — مست انکھڑیوں کی جُنبشِ مژگاں کا واسطہ

چٹکی سے چھوڑ ناوکِ ہستی شکار کو
مست انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں کا واسطہ

احساں نہ کیجیے

سنہ ۱۹۲۹ء

بربادِ پھر بزرگیٔ قرآں نہ کیجیے
اب زحمتِ اعادۂ پیماں نہ کیجیے

اب خانۂ امید میں ظلمت ہی نور ہے
تکلیفِ اہتمامِ چراغاں نہ کیجیے

دیکھے ہوئے ہوں کتنے بہار و خزاں کے رنگ
اب خارزارِ دل کو گلستاں نہ کیجیے

چھایا ہوا ہے مطلعِ امید پر غبار
اب رُخ پہ کاکلوں کو پریشاں نہ کیجیے

انجامِ عذر خواہیِ پیشیں کا واسطہ
اب اعترافِ جورِ فراواں نہ کیجیے

اب خطِ شوق بھیجیے بے رنگ ہی مجھے
افشاں کو صرفِ زینتِ عنواں نہ کیجیے

اب دل کو بزمِ ناز کی حسرت نہیں رہی
اب عُذرِ بدمزاجیٔ درباں نہ کیجیے

سلجھا چکا ہوں عُقدۂ آسودگی موت
اب ذکرِ خضر و چشمۂ حیواں نہ کیجیے

اب خنجرِ فراق کو رکھیے نہ میان میں
اب توسنِ وصال کو جولاں نہ کیجیے

اقرارِ اولیں کا جنازہ ہے دوش پر
اب تازہ رسمِ کہنۂ پیماں نہ کیجیے

جس دل پہ ناز تھا وہی باقی نہیں رہا
اب زندگی سے مجھکو پشیماں نہ کیجیے

دم ہی نہیں ہے جوش میں تجدیدِ شوق کا
احسان اب یہی ہے کہ احساں نہ کیجیے

گھٹا چھائی تو کیا؟

۱۹۳۵ء

چھٹ گئے جب آپ ہی اُودی گھٹا چھائی تو کیا؟ — تربتِ پامال کے سبزے پہ لہر آئی تو کیا؟

جب ضرورت ہی رہی باقی نہ لحن و رنگ کی — کوئلیں کوکیں تو کیا، ساون کی رُت آئی تو کیا؟

ہجر کے آلام سے جب چھُٹ چکی نبضِ نشاط — اب ہوا نے خار و خس میں رُوح دوڑائی تو کیا؟

ہو چکی ذوقِ تبسم ہی سے جب بیگانگی — اب چمن افروز پھولوں کو ہنسی آئی تو کیا؟

مر چکی جب موت کے جادے کی جانب زندگی — اب کسی نے عافیت کی راہ دکھلائی تو کیا؟

ہر نفس کے ساتھ دل سے جب دھواں اُٹھنے لگا — بادلوں سے چھن کے اب ٹھنڈی ہوا آئی تو کیا؟

سامنے جب آپ کے گیسو کی لہریں ہی نہیں — بدلیوں نے چرخ پر اب زُلف بکھرائی تو کیا؟

ہو چکا پایاب جب بحرِ سرو برگِ شباب — اب سمندر کی جوانی باڑھ پر آئی تو کیا؟

غنچۂ عہدِ طرب ہی مل چکا جب خاک میں — خاکِ گلشن اب گلِ تر بن کے اترائی تو کیا؟

مٹ چکے جب والہانہ بانکپن کے ولولے — آئی اب دوشیزۂ موسم کو انگڑائی تو کیا؟

کھل چکا جب پرچمِ غم زندگی کے قصر پہ — اب ہواؤں نے کمر پودوں کی لچکائی تو کیا؟

آنسوؤں میں بہہ گئیں جب حسن کی جولانیاں — جنگلوں کی چھاؤں میں برسات اٹھلائی تو کیا؟

جوشؔ کے پہلو میں جب تم ہی مچل سکتے نہیں
پھر گھٹا کے دامنوں میں برق لہرائی تو کیا

اب کیا کروں؟

سنہ ۱۹۳۵ء

چھا گئی برسات کی پہلی گھٹا اب کیا کروں؟
خوف تھا جس کا وہ آپہنچی بلا، اب کیا کروں؟

ہجر کو بہلا چلی تھی گرم موسم کی سموم
ناگہاں چلنے لگی ٹھنڈی ہوا، اب کیا کروں؟

آنکھ اٹھی ہی تھی کہ ابرِ لالہ گوں کی چھاؤں میں
درد سے کہنے لگا کچھ جھٹپٹا، اب کیا کروں؟

اشک ابھی تھمنے نہ پائے تھے کہ بیدردی کے ساتھ
بوندیوں سے بوستاں بجنے لگا اب کیا کروں؟

زخم ابھی بھرنے نہ پائے تھے کہ بادل چرخ پر
آگیا انگڑائیاں لیتا ہوا، اب کیا کروں؟

آچلی تھی نیند سی غم کو کہ موسم ناگہاں
بحر و بر میں کروٹیں لینے لگا اب کیا کروں؟

چرخ کی بےرنگیوں سے سست تھی رفتارِ غم
یک بیک ہر ذرّہ گلشن بن گیا اب کیا کروں؟

قفلِ بابِ شوق تھیں ماحول کی خاموشیاں
دفعتہً کا فرپپیہا بول اٹھا، اب کیا کروں؟

ہجر کا سینے میں کچھ کم ہو چلا تھا پیچ و تاب
بال بکھرانے لگی کالی گھٹا، اب کیا کروں؟

آنکھ جھپکانے لگی تھی دل میں یادِ لحنِ یاد
مور کی آنے لگی بن سے صدا، اب کیا کروں؟

گھٹ چلا تھا غم کہ رنگیں بدلیوں کی آڑ سے
ان کا چہرہ سامنے آنے لگا اب کیا کروں؟

آرہی ہیں برسر ان کی صدائیں "جوش جوش"
اے خدا اب کیا کروں، بارِ خدا اب کیا کروں؟

طوفان کی آرزو

سنہ ۱۹۳۰ء

پھر دل کو ہے جراحتِ پنہاں کی آرزو
یعنی کسی کی جنبشِ مژگاں کی آرزو

پھر چبھ رہے ہیں قلب میں غربت کے خار و خس
پھر ہے وطن کے سنبل و ریحاں کی آرزو

پھر ہے جمودِ شامِ بلا وحشت آفریں
پھر ہے طلوعِ صبحِ درخشاں کی آرزو

پھر روح، شورِ زاغ و زغن سے ہے بیقرار
پھر دل کو ہے خروشِ ہزاراں کی آرزو

پھر ہے ہوائے شہرِ ملامت کا اشتیاق
پھر ہے سوادِ کوچۂ جاناں کی آرزو

پھر قیدِ عقل و ہوش سے گھبرا چکا ہے دل
پھر ہے جنونِ سلسلہ جنباں کی آرزو

پھر ہے طلسمِ عشوۂ ترکانہ کی تلاش
پھر ہے فریبِ وعدۂ جاناں کی آرزو

پھر نبضِ شوق میں ہے تپاں خونِ اضطراب
پھر جوئے سست رَو کو ہے طوفاں کی آرزو

پھر قلب میں ہیں پہلوئے جاناں کی حسرتیں
پھر دوش پر ہے زلفِ پریشاں کی آرزو

پھر لے رہی ہے شدتِ وحشت سی کروٹیں
پائے طلب میں کوہ و بیاباں کی آرزو

پھر بخیہ ہائے چاکِ جگر کو ہے آج کل
اک شوخ کے تبسمِ پنہاں کی آرزو

پھر شعلہ زن ہے عصرِ تغافل گزیدہ میں
ماضی کے التفاتِ فراواں کی آرزو

پھر سقف و بام گوشۂ خلوت پہ ہے محیط
بزمِ نشاط و سیرِ گلستاں کی آرزو

پھر مسندِ خیال پہ ہے گرمِ رستخیز
شمع و شراب و شعر و شبستاں کی آرزو

پھر جلوہ گر ہے منظرِ وہم و خیال پر
اک نوبہارِ فتنۂ دوراں کی آرزو

بیزار ہے سکون کی راتوں سے جانِ زار
آنکھوں کو پھر ہے خوابِ پریشاں کی آرزو

بے گریۂ خال و خط پہ ہے رنگِ فسردگی
رُخ پر ہے آنسوؤں سے چراغاں کی آرزو

پھر کچھ دنوں سے دیدۂ گریاں ہے جوش میں
غلطاں ہے اُن کے گوشۂ داماں کی آرزو

پھر اُس طرف چلا ہوں

۱۹۳۰ء

پھر اُس طرف چلا ہوں فسانہ لیئے ہوئے — ماضی کا ہر نفس میں ترانہ لیے ہوے
پھر جا رہا ہوں جانبِ معمورۂ طرب — ویران دل میں غم کا خزانہ لیے ہوے
پھر خود سے مکر کرکے رواں ہوں سوئے نگار — سیر و سفر کا دل میں بہانہ لیے ہوے
پھر کوئے سرخوشی کی طرف بڑھ رہا ہوں میں — شعر و شراب و چنگ و چغانہ لیے ہوے
پھر جا رہا ہوں ذہنِ خرد آرمیدہ میں — بھولا ہوا جنوں کا زمانہ لیے ہوے
پھر بزمِ رنگ و بو کی طرف مڑ رہا ہے دل — خوں گشتہ زندگی کا فسانہ لیے ہوے
پھر گام زن ہوں میکدۂ دوش کی طرف — رفتار میں خمارِ شبانہ لیے ہوے

کیا نازِ عشق ہے کہ اُدھر جا رہا ہوں جوشؔ
اس فقر پر بھی طبعِ شہانہ لیے ہوے

دریوزہ — ! بھری

۱۹۳۰ء

ماضی کی سمت ہنسکے اشارا نہ کیجیے
اب ذکرِ آب و رنگِ تمنّا نہ کیجیے

مانوس ہو چکا ہوں غمِ روزگار سے
اب ساز و برگِ عیش مُہیا نہ کیجیے

سینہ مآلِ ذوقِ طرب سے ہی چاک چاک
اب فتنۂ نشاط کا دَر وا نہ کیجیے

سرمستیٔ شبانہ کا انجام، الاماں
اب اہتمامِ ساغر و مینا نہ کیجیے

دل کو لُبھا چکی ہیں تغافل شعاریاں
تکلیفِ التفات گوارا نہ کیجیے

راس آ چکی ہے عشق کو بیچین زندگی
اب میرے اضطراب کی پروا نہ کیجیے

دل صُلح کر چکا ہے زمانے کے بُخل سے
اب مرحمت کی زحمتِ بیجا نہ کیجیے

تھے جس میں وہ شرارِ گہ اللہ کی پناہ!
اب پھر اُسی اُمید کو پیدا نہ کیجیے

اُف ری مزاجِ حُسن کی باطل نوازیاں
اب عشقِ حق پسند کا چرچا نہ کیجیے

کیا فائدہ کہ جاگ اُٹھے پھر سے آرزو
اب ذکرِ بے وفائی دُنیا نہ کیجیے

ہر آن گوشِ رُوح میں چُبھتی تھی جسکی دھار
وہ لوچ پھر زبان میں پیدا نہ کیجیے

زخمی تھیں جس کی بارہا بے خواب کروٹیں — وہ تیغ اب نظر میں برہنہ نہ کیجئے

اک عمر اعتدال سے بھی لے چکا ہوں کام — اب شکوۂ مزاجِ تمنا نہ کیجئے

دل پر گزر چکی ہیں ہزاروں قیامتیں — اب مُسکرا کے وعدۂ فردا نہ کیجئے

سینے میں بے نقاب ہیں سابق کے تجربے — اب پُرسشِ خُلوص کا دعویٰ نہ کیجئے

تجدیدِ چاک کی نہیں دامن کو آرزو — اب نقلِ اضطرابِ زلیخا نہ کیجئے

لیکن اگر حضور کو بدبخت جوش پر
آتا نہیں ہے رحم، تو اچھا نہ کیجئے

گواہ رہنا

سنہ ۱۹۳۰ء

اے آم کے خوشنما درختو | اِس بات کے تم گواہ رہنا
اِس اُجڑے ہوئے مکاں کے آگے | تھمتا نہیں آنسوؤں کا بہنا!!

دریوزۂ نظر

سنہ ۱۹۳۰ء

خُدا کے واسطے اے حاجبو نہ دیر کرو
حریم ناز میں کوئی پُکار کر کہہ دو

کہ پھر کوئی وطن آوارہ و جگر افگار
مَلول و بیکس و مجبور و غم کش و بیمار

جگر کو خون کیے، سختیاں اُٹھائے ہوئے
درِ حضور پہ حاضر ہی سر جُھکائے ہوئے

دھڑک رہا ہے کلیجہ مرا ایک آنسو میں
پُکارتا ہی کہ دل اب نہیں ہی قابو میں

مرا رفیق نہیں ہی کوئی خُدائی میں
زمیں جگہ نہیں دیتی تری جُدائی میں

جبیں کے نقش میں رنگِ سجود بھرنے کو
ہوا ہوں دُور سے حاضر سلام کرنے کو

نہ مرحمت، نہ محبت کا خواستگار ہوں میں
بس ایک نیم نظر کا اُمیدوار ہوں میں

انتہائی — تعلقی

سنہ ۱۹۳۰ء

روبرو اُس کے گیا میں اس قدر مدت کے بعد
اِس کا کیا غم اُس نے ادنیٰ سی عنایت بھی نہ کی

مجکو تو صرف اس کا شکوہ ہی کہ اُس نے مجھ سی جوش
اتنے دن تک دُور رہنے کی شکایت بھی نہ کی

نقشِ خیالِ دل سے مٹایا نہیں ہنوز

سنہ ۱۹۳۰ء

نقشِ خیالِ دل سے مِٹایا نہیں ہنوز
بیدرد، میں نے تجکو بھلایا نہیں ہنوز

تیری ہی زلفِ ناز کا اب تک اسیر ہوں
یعنی کسی کے دام میں آیا نہیں ہنوز

یادش بخیر جس پہ کبھی تھی تری نظر
وہ دل کسی سے میں نے لگایا نہیں ہنوز

وہ سر جو تیری راہ گزر میں تھا سجدہ ریز
میں نے کسی قدم پہ جھکایا نہیں ہنوز

محرابِ جاں میں تو نے جلایا تھا خود جسے
سینے کا وہ چراغ بجھایا نہیں ہنوز

اُس پیکِ خاص کو جسے ٹھکرا چکا ہے تو
اپنی نظر سے میں نے گرایا نہیں ہنوز

بیہوش ہو کے جلد تجھے ہوش آگیا
میں بدنصیب ہوش میں آیا نہیں ہنوز

دُنیا نے تجکو خوابِ گراں سے جگا دیا
لیکن مجھے کسی نے جگایا نہیں ہنوز

تو کاروبارِ شوق میں تنہا نہیں رہا
میرا کسی نے ہات بٹایا نہیں ہنوز

گردن کو آج بھی تری بانہوں کی یاد ہے
یہ منّتوں کا طوق بڑھایا نہیں ہنوز

مر کر بھی آئے گی یہ صدا قبرِ جوشؔ سے
بیدرد میں نے تجکو بھلایا نہیں ہنوز

ہنوز یاد ہے

سنہ ۱۹۳۱ء

ہنوز یاد ہے وہ رنگِ اضطراب ترا
بھرا تھا درد کے نغموں سے جب رباب ترا

عجیب دَور تھا وہ دَور بھی حبیب او ظالم
لباسِ عشق میں تھا حُسنِ لاجواب ترا

جو شب کو رُوپ میں پروانے کے تھی شمع تری
سحر کو بھیس میں بلبل کے تھا گلاب ترا

وہ تیری پہلی ملاقات کی روپہلی رات
اُدھر تھا چاند، اِدھر دیدۂ پُرآب ترا

کبھی خدا کی مشیّت پہ برہمی تیری
کبھی خود اپنی تمنّاؤں پر عتاب ترا

وہ ماہتاب کے طوفاں میں اُلجھنیں تیری
وہ ابر و باد کی ہلچل میں اضطراب ترا

وہ ابتدائے محبّت کی تُند راتوں میں
بساطِ غم پہ مچلتا ہوا شباب ترا

وہ آنسوؤں کے دُھندلکے میں چشمِ زار تری
وہ کروٹوں کے تلاطم میں فرشِ خواب ترا

وہ بات بات میں چھالے کا سا ٹپک اُٹھنا
نظر جھکا کے وہ لہجہ دمِ خطاب ترا

وہ میری بزمِ محبت وہ تیری شمعِ جمال
وہ دامِ ذرّۂ خاکی میں آفتاب ترا

وہ تیری زلف کے خم سے مری پریشانی
وہ اپنی سانس کی خوشبو سے پیچ و تاب ترا

وہ اضطراب کا روندا ہوا سکون مرا — وہ وَلولوں کا ستایا ہوا حجاب ترا

مژہ کی طرح جھپکتا ہوا وہ میرا سوال — وہ دل کی طرح دھڑکتا ہوا جواب ترا

نہ پوچھ جوشؔ سے، کس درجہ تلخ و شیریں ہے

اُس التفات کے بعد اب یہ اجتناب ترا

یاد کرو وہ دِن

سنہ ۱۹۳۲ء

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے راز دانِ یک دِگر
راز دانِ یک دگر، شرح و بیانِ یک دگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے دورِ نوشانوش میں
لحنِ شیریں و شرابِ ارغوانِ یک دگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے قُربِ کامل کے طفیل
قالبِ یک دیگر و رُوحِ روانِ یک دگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے بزمِ فکر و بحث میں
ہم خیال و ہم نوا و ہم زبانِ یک دگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے عہدِ صُلح و جنگ میں
مہربانِ یک دگر، نامہربانِ یک دِگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے شام سے تا صُبحگاہ
قصّۂ یک دیگر و افسانہ خوانِ یک دِگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے کاروبارِ شوق میں
دولتِ یک دیگر و جنسِ دکانِ یک دِگر

یاد کرو وہ دن کہ ہم تھے آرزو کی راہ میں
کاروانِ شوق و گردِ کاروانِ یک دِگر

یاد کرو وہ دن، مرگِ جوش جب ناز و نیاز
دورِ سوز و ساز میں تھے ترجمانِ یک دِگر